جابر خان

جابِر خان

بچوں کے لیے ناول

زبیدہ سلطان

دو دوست

دیوار پر دنیا کا نقشہ لٹکا ہوا تھا۔ ماسٹر صاحب ہاتھ میں رُولر پکڑے جماعت کو جُغرافیہ کا نیا سبق پڑھا رہے تھے۔ سبق خاصا دل چسپ تھا اور لڑکے شوق سے سُن رہے تھے۔ دنیا کے نقشے پر وہ رنگ برنگ کے مُلک ان کے لیے کتنے پُرکشش تھے اور پھر ماسٹر صاحب جس انداز سے ان کے حالات بیان کر رہے تھے اس سے تو یوں لگتا تھا جیسے یہ سارے ملک ان کے دیکھے بھالے اور جانے پہچانے ہوں۔

ویسے تو سب ہی لڑکے بڑے غور سے سُن رہے تھے لیکن عارف کا اور ہی عالم تھا۔

وہ حیرت سے مُنہ کھولے اپنے استاد کے مُنہ کو تک رہا تھا اور اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں جیسے یہ نئ نئ باتیں اس کے دل میں گھر کرتی جا رہی ہوں۔ سبق ختم کرنے کے بعد ماسٹر صاحب نے لڑکوں کو سوالات کرنے کا موقع دیا تو سب سے زیادہ سوال عارف ہی نے پوچھے۔ ماسٹر صاحب مُسکرا مسکرا کر جواب دیتے رہے کیونکہ ان سوالات سے انہیں اپنے ہونہار شاگرد کی قابلیت کا پتا چلتا تھا اور وہ جان گئے تھے کہ اس لڑکے کو اپنی معلومات بڑھانے کا بہت شوق ہے۔

چھُٹّی ہوئی تو سب لڑکے سکول سے نکل کر اپنے اپنے گھروں کی طرف چلے۔ عارف بھی کتابیں بغل میں دبائے، سر جھکائے کسی گہری سوچ میں کھویا ہوا، آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا چلا جا رہا تھا۔ اس کا دوست اور ہم جماعت اعظم اس کے ساتھ ساتھ چل دیا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو عُرفی؟ اچھّی چُپ سادھ رکھی ہے جیسے گُونگے کا گُڑ کھا کر آئے ہو۔" اس کی خاموشی سے تنگ آکر اعظم بول اُٹھا۔ وہ باتونی لڑکا زیادہ دیر چپ نہیں رہ سکتا تھا۔

"کچھ نہیں۔" عُرفی نے جواب دیا۔

"کُچھ تو ضرُور ہے۔" اعظم نے کہا۔

"سچ عظمی، کوئی خاص بات نہیں۔"

"خبر عام بات ہی سہی۔ مگر میں ضرور پُوچھ کر چھوڑوں گا۔ تم یوں سر جھُکائے چُپ چاپ کیا سوچ رہے تھے؟"

"تم سن کر میری ہنسی تو نہیں اُڑاوٴ گے؟"

"لاوٴ ہاتھ، وعدہ رہا۔ ہنسی اُڑاوٴں تو تُم مجھ سے کُٹّی کر لینا۔" اعظم نے سنجیدگی سے عارف کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر وعدہ کیا۔ عارف کُچھ سوچ کر مُسکرایا۔ پھر کہنے لگا۔

"میں سوچ رہا تھا کہ دنیا کتنی بڑی جگہ ہے۔ اس کی لمبی چوڑی سطح پر پھیلے ہوئے یہ عجیب و غریب مُلک جن کا حال ہر روز ہمیں جغرافیے کے ماسٹر صاحب سناتے ہیں، دیکھنے سے تعلق رکھتے ہوں گے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں بڑا ہو کر ضرور اِن

ملکوں کی سیر کروں گا۔" وُہ اداسی سے مُسکرا کر اپنے دوست کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہاں ہاں۔ ضرور ضرور سیر کرنا ان ملکوں کی۔"

"مگر۔۔۔۔" عرفی کُچھ کہتے کہتے رہ گیا۔

مگر کیا؟ ابھی سے اگر مگر کرنے لگے تو تُم کر چُکے سیر اِن ملکوں کی۔ ایک طرف تو اتنا شوق اور دوسری طرف ڈِھل مِل یقین۔" اعظم نے ہنس کر کہا۔

"میں کہنے کو تھا کہ ابھی اس شوق کو پورا کرنے میں کئی سال باقی ہیں۔ ابھی تو میں نویں جماعت میں پڑھ رہا ہوں۔ بی اے کرنے میں پانچ سال پڑے ہیں۔ ابّو کہتے ہیں بی اے کے بعد وہ مجھے اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ بھیجیں گے مگر میں چاہتا ہوں کہ کسی ایسے محکمے میں ملازمت کروں کہ دُنیا کے ہر ملک کی سیر کر سکوں۔"

"واہ، ایسا کون سا محکمہ ہو گا جس کا ملازم ملک ملک جائے۔" اعظم سر ہلا کر بولا۔

"ہوائی جہازوں میں ملازم ہو کر آدمی ہر ملک میں جا سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے تم ہوائی جہاز کا پائلٹ بن جانا۔ ہیں؟" اعظم نے اپنے دوست کے

کندھے پر زور سے تھپکی دی۔

”ہاں، میں تو یہی کہتا ہوں مگر ابّو اور امّی نہیں مانتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں قانون کی اعلیٰ ڈگری حاصل کروں حالانکہ اگر وہ میری بات مان لیں تو انہیں انگلینڈ وغیرہ کا خرچ برداشت نہیں کرنا پڑے گا۔ ایف اے کر کے ہی میں پائلٹ بن سکتا ہوں۔“

”جب ایف اے کر لو تو اپنے ابّا امّی کو منا لینا۔ اس وقت تک تُم خاصے بڑے ہو جاؤ گے۔ خود مجھے بھی سیر و سیاحت کا بہت شوق ہے۔ میرا تو جی چاہتا ہے دوسرے ملکوں میں جا کر وہاں کی پرانی عمارتیں دیکھوں۔ بہت پسند ہیں مجھے یہ عجیب و غریب عمارتیں۔“

”کہیں اللہ میاں ایسا کر دیں کہ ہم تم اکھٹّے چلیں تو کتنا مزہ آئے!“ عارف کہنے لگا۔

”ہاں! بہت۔“ اعظم نے ہاں میں ہاں ملائی۔

اِتنے میں اعظم کا گھر آ گیا۔ عارف نے اُس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔
"اچھا عُظمی۔ خُدا حافظ۔"

"چلو آؤ کچھ دیر بیٹھو۔ باتیں کریں گے۔" اعظم نے کہا۔

"نہیں دوست، پھر کبھی سہی۔"

"آ بھی جاؤ۔ کھانا کھا کر چلے جانا۔ ابھی تمہیں دور جانا ہے اور اس وقت تم کہہ رہے تھے کہ بھوک لگ رہی ہے۔" اعظم نے اُسے کھینچتے ہوئے کہا۔

"مجھے دراصل امّی کا خیال ہے۔ میں دیر سے پہنچوں تو وہ پریشان ہونے لگتی ہیں۔ کھانے پر میرا اِنتظار کر رہی ہوں گی۔" عارف نے عُذر کیا تو اعظم کو خاموش ہو جانا پڑا۔

اِمتحان ہوئے نتیجہ نِکلا۔ عارف اور اس کا دوست اعظم دونوں اچھے نمبروں سے پاس ہو کر دسویں جماعت میں گئے۔ خُوب انعام ملے۔ دونوں کے پاس بہت سے روپے جمع ہو گئے اور وہ انہیں خرچ کرنے کے طریقے سوچنے لگے۔ بہار کی

چھٹیاں تھیں۔ فرصت اور بے فکری کے دِن تھے۔

اُس دِن صُبح صُبح اعظم عارف کے گھر جا پہنچا۔ عارف خُود اس کے ہاں جانے کو تیار ہو رہا تھا۔

"آؤ عظمی، اچھّا ہوا تم چلے آئے۔ میں تمہارے ہاں جا رہا تھا۔" اس نے اعظم کو دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "میں شام کو دیر تک تمہارا اِنتظار کرتا رہا۔ آج دُوسری چھُٹّی بھی سمجھو گزر گئی اور ہم نے چھٹیاں گزارنے کا کوئی پروگرام نہیں بنایا۔ آج بھی طے کر لیں تو باقی بیس دِن موجُود ہیں۔"

"پھر کیا سوچا ہے تُم نے؟" عارف نے پوچھا۔

"موسم بہت اچھا ہے۔ سفر میں دِقّت نہ ہو گی۔ ارجمند خاں اپنے گھر جا رہا ہے۔ چلو اسی کے ساتھ کوئٹہ چلیں۔" اعظم نے تجویز پیش کی۔

"اِجازت نہیں ملے گی گھر سے۔ ابّو تو سُنتے ہی کان اینٹھ دیں گے پکڑ کر۔"

"بھئی کوئی نہ کوئی تدبیر کرو۔ چلنا ضرور ہے۔ اچھّے شوقین ہو سیر و سیاحت کے۔

اتنی ہمّت بھی نہیں کر سکتے کہ کسی کی طرح اجازت ہی لے لو؟"

"کیسے اجازت لُوں دوست! امّی نے آج تک مجھے کبھی اکیلے جانے نہیں دیا۔ اور۔۔۔ پھر جائیں بھی کہاں؟ ہمارا تو کوئی عزیز کہیں باہر نہیں رہتا۔ سب لوگ یہیں موجود ہیں۔"

"میرے کئی رشتے دار دوسرے شہروں میں رہتے ہیں۔ ماموں جان نے کئی مرتبہ بُلایا ہے۔ میں اُن کے پاس کوئٹہ جاؤں گا۔ تُم بھی میرے ساتھ چلنا۔" اعظم نے نرمی سے کہا۔

"واہ، جانے کون دے گا۔" عارف مُسکرا کر بولا۔

"میں تو تمہیں ساتھ لیے بغیر نہ جاؤں گا۔ چاہے خالہ جان کے پاؤں پکڑ کر منّت کرنی پڑے۔" اعظم نے کہا۔

صحن میں عارف کی امّی کپڑے لکھ کر دھوبن کو دے رہی تھیں۔ اعظم نے سلام کیا تو انہوں نے خوش ہو کر جواب دیا۔

"آؤ عظمی، بہت دنوں بعد آئے؟" اپنے بڑے بیٹے عارف کے دوستوں میں وہ اعظم کو بہت اچھا سمجھتی تھیں۔

"خالہ جان امتحان میں پھنسے رہے۔ اب کہیں فُرصت ملی ہے۔" اعظم مُسکرا کر سر جھکاتے ہوئے بولا۔

"اچھّا، پھر اب چھٹیوں میں کیا شغل رہے گا۔"

"میں تو کوئٹہ جا رہا ہوں ماموں جان کے پاس۔"

"خوب پھِر تو مزے کی چھٹیاں گزریں گی۔ کوئٹے کی آب و ہوا بڑی صحّت افزا ہے۔ خوب موٹے تازے ہو کر آؤ گے وہاں سے۔" عارف کی امّی نے دلچسپی سے کہا اور ساتھ ہی عُرفی کی طرف نگاہ ڈالی جو اُداس نظروں سے اپنے دوست کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"خالہ جان، ایک درخواست ہے۔ وعدہ کیجیے کہ آپ مان لیں گی۔" اعظم نے کہا۔ "اچھّی درخواست ہے جسے ماننے کا وعدہ پہلے سے لیا جا رہا ہے۔" انہوں نے

ہنس کر کہا۔

"اگر آپ نے انکار کیا تو میرا دل ٹوٹ جائے گا اور پھر میں بھی نہیں جاؤں گا ماموں جان کے پاس۔" اعظم نے روہانسی شکل بنا کر کہا۔

"تم کہو تو سہی۔۔۔ بات کیا ہے؟"

"خالہ جان، عارف کو بھی میرے ساتھ جانے کی اجازت دے دیں۔ اسے سیر و سیاحت کا بہت شوق ہے۔ ماموں جان ہمیں کارخانے اور بجلی کے نئے گرڈ وغیرہ دکھائیں گے۔ اس طرح ہماری معلومات بھی بڑھیں گی اور سیر بھی ہو جائے گی۔"

"تو عُرفی جانا چاہتا ہے کیا؟ اِسے ایسے مقامات دیکھنے کا بہت شوق ہے۔"

انہوں نے اپنے بیٹے کو محبت بھری نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔ عارف کی لمبی لمبی بادامی آنکھیں خُوشی سے چمکنے لگیں۔ گندمی چہرہ سُرخی سے دمک اُٹھتا۔

"شوق تو ہے پر وہ کہتا ہے کہ مجھے گھر سے اِجازت نہیں ملے گی۔"

"چلا جاؤں امّی؟ ابّو مان جائیں گے؟"

"ہاں بھئی عظمی جو کہہ رہے ہیں، پھر ان کے ماموں جان بھی ساتھ ہوں گے۔ چلے جاؤ۔ تمہارے ابّو کو میں سمجھالُوں گی۔"

عارف مارے خُوشی کے دیوانہ سا ہو گیا۔ لپک کر ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور بولا۔ "میری اچھّی امّی۔"

"بھئی، مجھے چھوڑو تو سہی تم تو میرے کندھوں پر سوار ہو گئے۔" امُی نے ہنس کر کہا۔

"جاؤ سفر کی تیاری کرو۔ ابّو کُچھ نہیں کہیں گے۔"

تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اعظم عارف کی امّی کو سلام کر کے چلا گیا اور عُرفی سفر کی تیّاری میں لگ گیا۔ اعظم نے گھر پہنچ کر اپنے ابّو کو بتایا کہ عُرفی بھی اس کے ساتھ جارہاہے تو وہ بھی بُہت خُوش ہوئے۔ انہوں نے اعظم کو سفر خرچ کے لیے سو روپے دیے اور پچاس روپے چُپکے سے امّی نے تھما دیے کہ

پردیس کا معاملہ ہے۔ ضرورت پڑ جائے تو بچّہ کس سے مانگتا پھرے گا۔ اسی طرح عارف نے بھی کافی سفر خرچ اپنے والدین سے وصول کیا۔ اور دوسرے دن ضروری سامان لے کر دونوں دوست کوئٹہ روانہ ہو گئے۔

طرّے باز خاں

اعظم کے ماموں لڑکوں کو مناسب حد تک آزادی دینے کے قائل تھے تا کہ ان میں اپنے آپ پر بھروسا کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔ انہوں نے دونوں لڑکوں کو اکیلے سیر کرنے کی اجازت دے دی۔ وونوں دوست بلوچستان کے قابلِ دید مقامات کی سیر کرنے کے بعد مشہور سرحدی مقام دزداب پہنچے۔ وہاں کے قبائلی پٹھان نو عُمر بچوں کو یوں اکیلے سفر کرتے دیکھ کر بہت حیران ہوئے اور ان سے قسم قسم کے سوالات کرنے لگے۔ مگر یہ دونوں اُن کی زبان نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اشاروں سے انہیں اپنا مقصد سمجھانے کی کوشش کرتے یا کوئی شخص ایسا مل جاتا جو ٹوٹی

پھوٹی اردو یا پنجابی بول سکتا تو اس کے ذریعے اپنا مطلب سمجھاتے۔ آگے سفر کرنے کے لیے انہیں سواریاں بھی درکار تھی اور کوئی اچھّا رہنما بھی۔ خوش قسمتی سے ان کی ملاقات دو شکاریوں سے ہو گئی جو پنجاب کے رہنے والے تھے اور سفید بھالو اور برفانی لومڑیوں کے شکار کے لیے کاغان اور کافرستان کی مُہم سے واپس آ رہے تھے۔

یہ اتّفاقی مُلاقات یوں ہوئی کہ عُرفی اور عظمی ایک معمولی قسم کے ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے کہ ان کے دو اور ہم وطن بھی اسی ہوٹل میں داخل ہوئے اور ذرا فاصلے پر بیٹھ کر کھانا لانے کا حکم دیا۔ دونوں لڑکے ان آدمیوں کو دلچسپی سے دیکھنے لگے۔ اعظم نے دیکھا کہ کھانا کھاتے کھاتے ایک آدمی نے ایک دم دوسرے سے کچھ کہا اور پھر وہ غور سے ان قبائلی پٹھانوں کی باتیں سُننے لگے جو ان کے قریب ہی دروازے کے پاس کھڑے تھے۔ ان دونوں آدمیوں کے چہرے پر دہشت کے آثار تھے اور وہ رہ رہ کر ان دونوں لڑکوں کی طرف بھی دیکھ رہے تھے۔

”عظمی، ہو نہ ہو وہ پٹھان ہمارے متعلق گفتگو کر رہے ہیں۔ اور یہ آدمی ان کی بولی سمجھ سکتے ہیں۔ ضُرور کوئی خطرے کی بات ہے۔“ عُرفی کہنے لگا۔

اعظم کی ان لوگوں کی طرف پُشت تھی۔ عارف کے کہنے پر وہ قریب کے خالی سٹول پر بیٹھ گیا اور نیچی نگاہوں سے اُن اجنبی آدمیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ چند ہی لمحوں میں اُسے بھی یقین ہو گیا کہ عُرفی کا اندازہ درست ہے۔ اتنے ہی میں ان دونوں آدمیوں میں سے ایک اُٹھ کر ان کے قریب آیا اور انگریزی میں بولا:

”کیا تم انگریزی سمجھ سکتے ہو؟“

”جی ہاں۔ تھوڑی بہت سمجھ لیتے ہیں۔ ہم دسویں جماعت کے طالبِ علم ہیں۔“ اعظم نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”تشریف رکھیے۔“ عارف نے قریب پڑے ہوئے خالی سٹول کی طرف اشارہ کیا۔

”بہتر ہو گا کہ ہم باہر چل کر باتیں کریں۔ آپ دونوں نے کھانا ختم کر لیا ہے؟“

وہ انگریزی میں بولا۔

"جی ہاں۔" اعظم نے جواب دیا۔ اس پر وہ شخص کہنے لگا۔ "میرا نام قاسم ہے اور یہ میرے دوست عاقِل صاحب ہیں۔ آیئے باہر چلیں۔"

وہ چاروں دروازے کی طرف بڑھے۔ راستے میں کھڑے ہوئے وہی قبائلی ان کی طرف عجیب نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

"عجیب بات ہوئی۔ یہ دونوں بچّے ہمارے قریبی دوست کے بچّے نکل آئے۔" قاسم نے قبائلیوں سے انہیں کی زبان میں کہا اور عاقِل انگریزی میں لڑکوں سے بولا۔ "ان پٹھانوں کے سامنے یہ ظاہر کرنا کہ ہم لوگ پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔"

قاسم کی بات پر قبائلیوں نے بے یقینی کے انداز سے سر ہلاتے ہوئے ان کی طرف دیکھا اور ایک قبائلی نے سُرخ سُرخ آنکھوں سے انہیں گھورتے ہوئے کہا۔ "کاں جاتا ساب لوگ؟"

” اندر سردی ہے۔ ذرا دھوپ میں کھڑے ہوں گے۔“ قاسم نے جواب دیا۔

”ٹیک اے۔“ سُرخ آنکھوں والے پٹھان کے ساتھی نے جواب دیا اور وہ چاروں چند قدم ہٹ کر دھوپ میں جا کھڑے ہوئے۔

”تم لوگ خطرے میں ہو۔ یہ قبائلی تُمہارے سے متعلق منصوبے بنا رہے ہیں۔ وہ سُرخ آنکھول والا تم دونوں کا سامان اور روپے لے کر تمہیں اپنے باقی تین ساتھیوں کے سپرد کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ وہ تمیں سرحد پار لے جا کر بیچ دیں گے۔ “

اگرچہ بات ایسی تھی کہ دہشت زدہ ہونا لازمی تھا مگر لڑکوں نے اپنے حواس قائم رکھنے کی پوری کوشش کی۔

”اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔“ اعظم نے پوچھا۔

”میں نے اُن سے کہہ دیا ہے کہ ہمارے دوست کے لڑکے ہیں۔ اب ہمیں فیصلہ کرنا چاہیے کہ ہمارے ساتھ مِل کر اپنا سفر جاری رکھو گے یا واپس جاؤ گے؟“ قاسم

نے کہا۔

اعظم اور عارف ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

''کیوں عظمی؟ میں تو سوچتا ہوں واپس چلیں۔'' عارف کہنے لگا۔

''جیسے تمہاری مرضی۔ لیکن اب ہماری حفاظت کے لیے یہ لوگ جو ہیں۔ ہم ان کے ساتھ ہوتے ہوئے بالکل محفوظ ہیں۔ پھر کیوں نہ سفر جاری رکھیں۔ سیر کرنے کے علاوہ شکار کا موقع بھی ملے گا۔''

''تمہاری یہ بات بھی معقول ہے۔ اتنی مُشکل سے اجازت ملی گھر سے نکلنے کی۔ راستے ہی سے پلٹ جانے کے خیال سے دل کُڑھتا ہے۔''

''تو چلو چلتے ہیں۔'' اعظم نے خوش ہو کر کہا اور قاسم اور عاقل کی طرف دیکھنے لگا۔

''اگر چلنا چاہو تو ہم بڑی خوشی سے تمہاری حفاظت کریں گے۔'' قاسم نے کہا۔

''ہمارے چھوٹے بھائی بھی تمہاری عمر کے ہیں۔ ہمیں اپنا بڑا بھائی سمجھو۔ ہم

دونوں بھی تمہاری طرح بچپن کے ساتھی ہیں اور سیر و شکار کے لیے اکٹھے ہی نکلتے ہیں۔" قاسم نے عارف کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار سے کہا۔

"ان لوگوں کے سامنے ہمیں اپنے رشتے دار ظاہر کرنا اور انگریزی میں گفتگو کرنا۔ یہ لوگ اردو سمجھ سکتے ہیں۔" عاقِل نے ان کو ہدایت کی۔

"بہت اچھا بھائی جان، ہم اس کا خیال رکھیں گے۔" اعظم نے جواب دیا۔

ہمارے ساتھ ایک بہت اچھا کوہستانی ہے جو تمام پہاڑی راستوں سے واقف ہے۔ سواریاں البتہ دو اور چاہئیں۔ بار برداری کے لیے ہمارے ہی جانور کافی ہیں، تمہارے پاس کچھ ایسا زیادہ سامان تو نہیں ہو گا؟" قاسم نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ بس ایک بستر اور ایک سوٹ کیس ہے۔"

"تو بس ہم اسی وقت روانہ ہوں گے تاکہ شام ہونے سے پہلے پہلے اگلے پڑاؤ پر پہنچ جائیں۔" قاسم نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" عاقل نے جواب دیا اور وہ دھوپ میں آہستہ آہستہ ٹہلتے ہوئے

پھر اُسی جھونپڑے کی طرف آئے جسے وہاں ہوٹل کا نام دیا جاتا تھا۔ وہاں چند آدمی ہتھیار فروخت کر رہے تھے۔ قاسم نے ایک آدمی کو قریب بُلایا اور دو ہلکی قسم کی رائفلیں لڑکوں کے لیے خریدیں۔ لڑکے زندگی میں پہلی مرتبہ ہتھیار پا کر خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔ اس علاقے میں اسلحہ رکھنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔

ہوٹل کے مالک کو کھانے کا بِل ادا کرنے کے بعد وہ باہر نکلے ہی تھے کہ وہی سُرخ آنکھوں والا پٹھان ایک اور کوہستانی کو ساتھ لیے اُن کی طرف آیا اور کہنے لگا۔ ”خو دیکو۔ چوکرا لوگ، یہ بوت ہوشیار بدرقہ (رہنما) ام تمہارے واسطے لایا۔ یہ تمارا سامان بھی اُٹھائے گا اور اسلحہ اور سواری کا بھی بندوبست کرے گا اور تُمارے کھانے پینے کو بھی آپ ہی پکائے گا۔“

”خان، ہمیں صرف سواری کی ضرورت ہو گی۔ ہمیں اپنے یہ عزیز مل گئے ہیں۔ ہم اب ان کے ساتھ ہی جائیں گے۔“ اعظم نے جواب دیا۔

”خو پہلے تمارا عزیز کِدر سویا اُوا تا؟ تُم نے کیوں بندوبست کرنے کے واسطے بولا؟“

پٹھان لال پیلی آنکھیں کر کے بولا۔

"ان بچّوں کو معلوم نہ تھا۔ ہم لوگ اِتّفاق سے انہیں اِس جگہ مل گئے۔ اب یہ ہمارے ساتھ ہی جائیں گے۔" قاسم نے آگے بڑھ کر کہا۔

"خوام خوب جانتا کہ تم ان کے لوگ کا کُوچ نہیں لگتا۔ تُم نے اس جگہ اِن کو دیکا اور ورغلایا۔" پٹھان ہاتھ ہلا ہلا کے بلند آواز سے چیختے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس کے باقی ساتھی اور ہوٹل کے ملازم بھی جمع ہو گئے اور انہوں نے چاروں کے گرد حلقے باندھ لیا۔

"ان سے پوچھ لو، کہ یہ ہمارے رشتے دار ہیں یا نہیں۔" قاسم نے کہا۔ وہ دھیمے مزاج کا آدمی تھا مگر اس کا دوست عاقل نہ صرف عقل میں اس سے تیز تھا بلکہ مزاج کا بھی تیز تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دیو جیسے لمبے تڑنگے پٹھان کو شانے سے پکڑ کر دو چار جھٹکے دیے اور غصّے سے سُرخ ہوتے ہوئے بولا۔

"اے خان، تُم اتنے تیز کیوں ہو رہے ہو؟ ان لوگوں پر تمہاری زبردستی نہیں چلے گی۔ یہ اپنی خوشی سے جہاں چاہے جائیں۔ معلوم ہوتا ہے تماری اپنی نیّت

ٹھیک نہیں اور تم ان بچّوں کو خود بہکانے کا ارادہ رکھتے ہو۔"

اس پر وہ پٹھان اور بھی غصّے میں بھر گیا اور گالیوں پر اُتر آیا۔ اب تو قاسم کو بھی غصہ آ گیا۔ اس نے پٹھان کو بندوق کے کندے سے کچوکا دے کر دو قدم پرے دھکیل دیا۔

"مُنہ سنبھال کر بات کرو ورنہ گولی مار دوں گا۔" اس نے غضب ناک ہو کر کہا۔

"گولی مار دیں گا۔۔۔؟ امارا پاس رائفل نئیں ہے کہ تمارا گولی کھالیں گا؟" پٹھان نے یہ کہہ کر ایک آدمی کی طرف ہاتھ بڑھایا جس نے لپک کر رائفل تھما دی۔ "آؤ اب چلاؤ گولی۔ دیکھیں کسی کا نشانہ پکّا ہے۔"

قریب تھا کہ معاملہ گولیاں چلنے تک جا پہنچے کہ ہوٹل کے مالک نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ وہ جھگڑالو پٹھان کو پکڑ کر ایک طرف لے گیا اور اسے کچھ ایسے طریقے سے سمجھایا کہ اس کا غصّہ ایک دم سرد پڑ گیا۔ وہ واپس آتے ہوئے اس سے اپنی زبان میں کہہ رہا تھا۔

”تمہاری خاطر ان بدبختوں کو میں نے چھوڑ دیا ورنہ مزہ چکھا دیتا۔ طرّہ باز خان نے آج تک کسی کی بات نہیں سُنی۔۔۔“

”اچھا، طرّہ باز خاں نام ہے اس دیو کا۔“ عُرفی نے کہا۔

”ہاں، مگر دیو خان ہوتا تو ٹھیک تھا۔“ قاسم نے مُسکرا کر کہا۔

”طرّہ تو ہے نہیں۔ پھسڈّی جیسی ٹوپی پہنے ہوئے ہے اور نام طرّہ باز خان۔“ عظمی ہنس کے بولا۔ اس کی بات پر سب مُسکرا دیے۔ طرّہ باز خان اپنے ساتھیوں میں اس طرح جا کھڑا ہُوا جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ اور ہوٹل کا مالک قاسم اور عاقِل سے کہنے لگا۔

”بات یہ ہے صاحب کہ ان غریبوں کو کبھی کبھی یہ موقع ملتا ہے کہ کوئی شوقین امیر زادہ سیر و شکار کے لیے اس طرف آ نکلے اور یہ اس کی خدمت کر کے چار پیسے کما لیں۔ بس اور کوئی بات نہیں۔“

”اچھا خان، یہ لو اپنا حساب اور باقی ہماری طرف سے نوکروں کا انعام۔“ عاقِل

نے دس روپے کا نوٹ مالک کو دیتے ہوئے کہا۔ اُس نے سلام کرتے ہوئے فوراً نوٹ جیب میں ڈال لیا۔ قاسم نے اپنے رہنما کو اشارہ کیا کہ ان لڑکوں کا سامان بھی خچّر پر رکھ لے اور وہ چاروں ہوٹل سے نکل آئے۔

انہیں ابھی میدانی علاقے ہی میں سفر کرنا تھا اس لیے سواری کے لیے دو خچّر درکار تھے۔ بہت سے لوگ وہیں گھوڑے اور خچّر لیے ہوئے موجود تھے۔ کرایہ طے کرکے دو اچھّے تیز رفتار خچّر عارف اور اعظم کے لیے لے لئے گئے۔ جب وُہ سوار ہو رہے تھے تو عُرفی نے پلٹ کر دیکھا۔ طرّہ باز خان تو کہیں نظر نہ آیا مگر اس کے دو ساتھی خونخوار نظروں سے ان کی طرف دیکھ دیکھ کر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

عظمی کے مخاطب کرنے پر اس کی طرف متوجہ ہوا تو وُہ سفید خچر پر سوار ہو چکا تھا۔ مگر سواری کا عادی نہ ہونے کی وجہ سے ڈر رہا تھا۔ عارف نے اس کا خوب مذاق اُڑایا۔ عارف اور قاسم بھی ہنسنے لگے۔

خطرناک سفر

کوئٹے کے ارد گرد، سوائے چند بادام کے باغوں کے کوئی سر سبز جگہ نہیں تھی۔ دور دور تک ننگے پہاڑوں کے سلسلے ملے ہوئے تھے۔ لیکن شام ہوتے ہوتے وہ ایسے علاقے میں پہنچ گئے جہاں چاروں طرف سبزہ اور انگوروں کے باغ تھے۔ بے شمار درخت سفید اور گلابی شگوفوں سے لدے ہوئے تھے۔ ان کی ہلکی ہلکی خوشبو سرد ہوا میں رچی ہوئی تھی۔ عارف اور اعظم تو اس منظر میں اس قدر کھو گئے کہ انہیں سردی کا بھی احساس نہ ہوا۔ آخر وہ قاسم کی آواز پر چونکے۔

”ننھے دوستو۔ تم تو خبر نہیں کیوں گُم سُم ہو کر رہ گئے۔ کیا گھر یاد آ رہا ہے؟“

”جی نہیں تو۔۔۔“ عارف نے شرمندہ ہو کر کہا۔

”پھر چپ کیوں ہو؟“ قاسم نے پُوچھا۔ ”یہ منظر کُچھ ایسا دل کو بھایا کہ بولنا تک یاد نہ رہا۔“ عارف نے بھولے پن سے جواب دیا۔ عاقل اور قاسم دونوں ہنسنے لگے۔

”پھر تو تم نہ سیّاح ہو نہ شکاری۔ صرف شاعر ہو میرے بھیّا۔“ قاسم نے کہا۔

”دوسرے صاحب کا بھی یہی حال ہے۔“ عاقل نے اعظم کی طرف اشارہ کیا۔

”جی میں۔۔۔؟ جی میں تو سوچ رہا تھا کہ۔۔۔“

وہ کچھ بات بتانا چاہتا تھا کہ قاسم نے اس کا فقرہ اُچک لیا”کہ کتنا سہانا منظر ہے۔“

”جی نہیں۔۔۔ میں سوچ رہا تھا کہ۔۔۔۔“

وہ اپنی سوچ کو لفظوں میں بیان نہ کر پایا اور قاسم نے پھر بات کاٹی:

”میاں کیوں ضِد کرتے۔۔۔ مان جاؤ کہ تم کچھ بھی نہیں سوچ رہے تھے بلکہ صِرف منظر میں کھوئے ہوئے تھے۔“

اب اعظم بھی ہنس کر قائل ہو گیا اور بولا۔ ”بھائی جان، دیکھیے ناقدرت کے یہ خوب صورت مناظر خواہ مخواہ انسان کے دل میں اُتر جاتے ہیں۔“

”ہاں اور انہیں میں تم دونوں اس قدر کھوئے کہ سردی کا احساس بھی نہ ہوا۔ خاصی ٹھنڈ ہو چلی ہے بڑے کوٹ پہن لو۔“ عاقل بولا۔

ان دونوں نے کوٹ اُٹھائے اور رفتار کم کر کے کوٹ پہننے لگے۔ پھر خچّر بڑھا کر قاسم اور عاقل کے برابر آ گئے۔

”بھائی جان، کیا آپ کو یہ دل کش اور سُہانے منظر اچھے نہیں لگتے۔“ اعظم نے پوچھا۔

”بھئی اچھے کیوں نہیں لگتے۔ کیا ہم انسان نہیں؟ ہم خوب صورت منظر دیکھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں مگر ان میں اس حد تک کھو نہیں جاتے کہ سب کچھ بھول کر خوابوں کی دنیا میں پہنچ جائیں اور یہ تک نہ سوچیں کہ یہ سفید اور گلابی پھولوں سے لدے ہوئے حسین درخت کس چیز کے ہیں۔ جس علاقے میں ہم سفر کر رہے ہیں یہاں پر کس قسم کی پیداوار ہوتی ہے۔ یہاں کے باشندوں کا

ذریعۂ معاش اور پیشہ کیا ہے۔ وغیرہ۔ “

عاقل باتیں کر رہا تھا اور اعظم اور عارف غور سے سُن رہے تھے۔

”میں آپ سے پوچھنا چاہتا تھا بھائی جان، مگر شرم کے مارے نہ پُوچھا۔“ عارف کہنے لگا۔

”ارے شرم کا اِس میں کیا دخل؟“ قاسم قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ”یہی کہ آپ کہیں گے کہ اس لڑکے کو اتنا بھی معلوم نہیں۔ “

”جو لڑکے اس جھجک سے کوئی بات نہیں پوچھتے کہ دوسرا انہیں کم علم نہ سمجھ بیٹھے وہ کبھی کوئی نئی بات نہیں سیکھ سکتے۔ ہر بات کی کرید کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کرنا چاہیے۔“

”اچھا تو بھائی جان، یہ بیلیں کس چیز کی ہیں؟ میں کافی دیر سے سوچ رہا تھا مگرے پوچھتے ہوئے جھجک محسوس ہوئی۔“ عارف نے شرماتے ہوئے کہا۔

”یہ انگور کی بیلیں ہیں ۔ انہیں تاک کہتے ہیں اور انگوروں کے یہ باغات

'تاکستان' کہلاتے ہیں۔ اس علاقے کے بہت سے لوگوں کا روزی کمانے کا یہی ذریعہ ہے۔ وہ انگور ملک کے دوسرے علاقوں میں بھیجتے ہیں۔" عاقل نے جواب دیا۔

"اور بھائی جان! یہ درخت؟ جو پھولوں کے بڑے بڑے گلدستے معلوم ہوتے ہیں؟" اعظم نے پوچھا۔

"یہ سیب اور شفتالو کے درخت ہیں۔" عاقل نے بتایا۔

اب وہ خاصی اونچائی پر پہنچ گئے تھے۔ ایک پہاڑی کے گرد چکر کاٹ کر جب وہ موڑ مڑ رہے تھے تو اعظم نے سامنے میدان پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے کہا۔

"بھائی جان، وہ دیکھیے کچھ اور لوگ بھی آرہے ہیں۔"

"چلو اچھا ہے انہیں اسی پڑاؤ پر روک لیں گے اور رات کو خوب رونق رہے گی۔" قاسم نے خوش ہو کر کہا اور پھر غور سے دیکھنے کے بعد بولا:

"یہ سیاح تو معلوم نہیں ہوتے۔ اسی علاقے کے لوگ ہیں۔"

یہ سن کر عارف نے دُور بین آنکھوں سے لگائی اور اس طرف دیکھا۔ ”ہوں۔ یہ تو وہی بد بخت طُرّے باز خان اور اس کے ساتھی ہیں۔ یہ ہمارے پیچھے پیچھے کِس غرض سے آئے ہیں؟“ یہ کہہ کر اس نے اپنے رہنما کو قریب بُلا کر اس واقعے سے آگاہ کرتے کہا۔

”اب ہم اس پڑاؤ پر نہیں ٹھہریں گے۔ ہمیں کسی قریبی گاؤں میں ٹھہراؤ تو بہتر ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ خواہ مخواہ کسی جھگڑے میں اُلجھیں۔ اگر ان میں سے کوئی ہمارے ہاتھ سے مارا گیا تو افسروں کو بیان وغیرہ دینے کے لیے ٹھہرنا پڑے گا اور خواہ مخواہ وقت ضائع ہو گا۔“

”ہاں یہی وجہ ہے ورنہ ہم اِن بدبختوں سے تو نہیں ڈرتے۔ اگر چاہیں تو ایک ایک کو گولی کا نشانہ بنا دیں۔“ قاسم نے کہا۔

”تو بہتر۔ ام ساب کو قریب کے قریے میں لے چلتا۔ مگر رات گئے پہنچیں گا۔ ذری دُور اے۔“ رہنما کہنے لگا۔

”کوئی بات نہیں۔“ عاقل نے کہا۔

"بوت اچّا۔ چلو۔" رہنا اپنے خچّر کی باگ اُٹھاتے ہوئے بولا اور اِن کے آگے آگے ہو لیا۔ وہ اپنے مقررہ پڑاؤ پر تو اندھیرا ہوتے ہوتے پہنچ جاتے مگر کسی گاؤں میں ٹھہرنے کے لیے انہیں اس راستے سے مخالفت سمت جانا تھا۔ یہ بھی بہتر ہوا کہ پہلی تاریخوں کا چاند سرِ شام ہی نکل آیا اور اس کی مدھم روشنی میں وہ آسانی سے اپنے رہنما کے پیچھے پیچھے چلتے گئے۔

عشاء کی نماز کے وقت وہ لوگ ایک چھوٹے سے گاؤں میں داخل ہوئے۔ گھروں کے اندر چراغ ٹمٹما رہے تھے۔ سردی خاصی تھی اسی لیے گلیوں میں سنّاٹا تھا۔ اجنبیوں کی آہٹ پا کر، کونوں کھدروں میں دُبکے ہوئے کتّوں نے کان کھڑے کیے اور پھر بھونک بھونک کر آنے والوں کا استقبال کرنے لگے۔ رہنما قریے کی اونچی نیچی ناہموار اور تاریک گلیوں میں سے ہوتا ہوا آخر انہیں ایک بہت بڑے پھاٹک کے سامنے لے آیا جو ایک اُونچی اور سنگین حویلی کا صدر دروازہ تھا۔ کتّوں کی آوازوں سے حویلی کا مالک سمجھ گیا تھا کہ کوئی اجنبی آبادی میں داخل ہوا ہے اور ان کے دستک دینے سے پہلے باہر پہنچ کر پھاٹک کھول رہا

تھا۔

"آیئے آیئے۔ میرے مہربان مہمانو، اندر تشریف لے آیئے۔" اس نے پھاٹک کھولتے ہوئے کہا۔ اُس کے پیچھے ایک نو عُمر کا مُشعل ہاتھ میں لیے روشنی دکھا رہا تھا۔ مشعل کی روشنی رہنما کے چہرے پر پڑی تو حویلی کا مالک بولا "اوہو، یہ تو اپنا دوست شاندار خاں ہے۔" پھر اُس نے باری باری سب کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ وہ لباس سے تو اسی علاقے کا رہنے والا معلوم ہوتا تھا مگر خاصی صاف اردو بولتا تھا۔ شان دار خان نے اسے بتایا کہ یہ لوگ سیر کی غرض سے پنجاب سے آئے ہیں۔ ارادہ تو خضرہ کے ڈاک بنگلے پر ٹھہرنے کا تھا مگر ایک خاص وجہ سے راستے میں پروگرام بدل دینا پڑا۔

"ہم لوگوں نے ایک خاص مجبوری کے تحت اس وقت آپ کو زحمت دی۔" عاقل نے کہا۔ "زحمت کیوں؟ میرے لیے آپ کا آنا عین رحمت ہے۔۔۔ کئی دِنوں سے کوئی مسافر اِدھر نہیں آیا۔ میرا گھر سُونا پڑا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس آمد کے لیے مجھے اپنے دوست شاندار خان کا شکر گزار ہونا چاہیے یا اس

مجبوری کا جو آپ کو پیش آ گئی۔"

اس نے ہنستے ہوئے کہا اور اپنے مہمانوں کو لے کر مکان کے اندر آیا۔

"ماشاء اللہ! نہایت خوش مزاج آدمی ہیں آپ۔" عاقل نے مسکرا کر کہا۔

"جی ہاں۔ اور اس سے بڑھ کر خوش قسمت کہ آپ صاحبوں کی خدمت کا موقع میسر آیا۔" وہ بولا۔

"ملازم لڑکا مشعل بر آمدے کی دیوار گیر میں رکھ کر دہلیز میں کھڑا ہو گیا۔ یہ کمرہ جس میں وہ سب داخل ہوئے ایک وسیع ایوان تھا جس کے چاروں گوشوں میں اُونچے اُونچے شمع دانوں میں بڑی بڑی شمعیں روشن تھیں۔ آتش دان میں لکڑیوں کا الاؤ جل رہا تھا۔ فرش پر مسند اور تکیے لگے تھے۔ کمرے کی حرارت سے مسافروں کو بے حد سکون محسوس ہوا۔ آتش دان کے قریب ایک اونچی مسند تھی جو ایک کُشادہ تخت پر سُرخ قالین بچھا کر بنائی گئی تھی۔ مہمانوں کو بٹھا کر صاحبِ خانہ نے لڑکے سے کہا:

"بوستان، قلندر کو فوراً حاضر کرو۔ مہمانوں کے واسطے کھانا تیار کرے۔"

"نہیں صاحب۔ اس وقت کسی کو زحمت نہ دیجیے۔ کھانے پینے کا کچھ سامان ہمارے پاس موجود ہے۔ اسی سے گزارا ہو جائے گا۔" قاسم نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"اللہ رحم کرے۔ آپ نے یہ زحمت کا لفظ خُدا جانے کہاں سے سیکھ لیا۔" میزبان نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"ساب، یہ امارا سردار خضر خان بوت مہمان نواز مرد اے۔ دیکنا آپ لوگوں کا کتنا خدمت کرتا۔" شاندار خان کہنے لگا۔

"خدا نے جو اتنا کچھ دے رکھا ہے تو اس کا کُچھ اچھّا مصرف بھی تو ہونا چاہیے۔" میزبان جس کا نام خضر خان تھا کہنے لگا۔ اتنے میں بوستان ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کو ساتھ لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ خشخشی داڑھی والا یہ شخص بن مانس سے ملتا جلتا تھا۔ چھوٹا قد، اس پر چوڑا چکلا جسم۔ بے ڈھنگے اعضا، ٹیڑھی ٹیڑھی ٹانگیں۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی غلافی آنکھوں کو جھپک جھپک کر ہاتھوں کو مسل رہا

تھا۔ ”قلندر، مہمانوں کے لیے پنجابی قِسم کا کھانا تیار کرو۔“ خضر خان نے حکم دی۔

”ٹھیک ہے۔“

اس نے موٹے موٹے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے گردن ہلا کر جواب دیا اور سر جھُکا کر چلا گیا۔

عُرفی اور علی چپکے چپکے منہ چھپا کر ہنس رہے تھے۔

”کیا بات ہے؟ ہمارے نئے دوست کسی بات پر خوش ہو رہے ہیں۔“ خضر خان نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ بچے ہیں نا۔“ عاقل نے ٹالنا چاہا۔ اگرچہ وہ سمجھ چکا تھا کہ عارف نے اس خادم پر کوئی پھبتی کہی ہو گی۔

”قلندر کو دیکھ کر ہنسی آ گئی ہو گی۔ وہ شے ہی ایسی ہے۔ میرا ایک دوست اُسے پہلی مرتبہ دیکھ کر بے ساختہ پُکار اُٹھا تھا کہ قلندر کیا یہ تو اچھا بھلا بندر ہے۔“ خضر خان خُود بھی بچوں کے ساتھ مل کر ہنسنے لگا۔

”جی ہاں۔ یہاں لوگ خبر نہیں اُلٹ نام کیوں رکھتے ہیں۔۔۔ پھسڈّی ٹوپی پہننے والے کا نام طرّہ باز خان اور جس کی صورت بندر سے ملتی ہو اس کا نام قلندر۔“ عرفی نے بھولے پن سے کہا تو سب قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔

”ٹیک بولتا چھوٹا ساب۔ اب مُجھے دیکھو۔ نام تو شان دار خان اور شان تمام عمر دیکھنے کو نئیں ملی۔ “

اسی پر ایک اور فرمائشی قہقہہ پڑا۔ کچھ دیر ناموں پر بات چیت ہوتی رہی۔ اس کے بعد تعارف ذرا تفصیل کے ساتھ شروع ہوا۔ مہمانوں نے اپنے متعلق جو کُچھ بتایا اس سے میزبان کو یہ معلومات حاصل ہوئیں کہ وہ لوگ آسودہ گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ سیر و شکار کے شائق ہیں۔ سمو دار جانوروں کی کھالیں جمع کرنا ان کا مشغلہ ہے۔ اور اپنے متعلق خضر خان نے انہیں بتایا کہ وہ تاجر ہے۔ اس کے کارندے دوسرے شہروں میں مقرر ہیں۔ وہ خود بھی اپنا وقت سیر و شکار میں گزارتا ہے۔

”اس علاقے میں سوائے لومڑی کے اور کوئی سمو دار جانور آپ کو نہیں ملے گا۔

برفانی ریچھ شمالی علاقے کی سرحدوں پر ہوتے ہیں۔ البتّہ ایک چیز کا شکار آپ یقیناً پسند کریں گے۔ ان پہاڑوں کے دامن میں چند میل کے فاصلے پر ایک ریگستانی سطح مرتفع ہے۔ وہاں کستورا ہرن ملتا ہے جس کی ناف میں مُشک ہوتا ہے۔۔۔ آپ جانتے ہیں نا مُشک جسے کستوری بھی کہتے ہیں۔" خِضر خان نے کہا۔

"جی ہاں۔" قاسم نے خوش ہو کر جواب دیا۔

"اچھا؟ اس علاقے میں کستورا ہرن ملتا ہے؟" عاقل نے جیسے اپنے میزبان کے بیان پر شک کرتے ہوئے پوچھا۔ کیوں کہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ قیمتی ہرن چینی ترکستان کے بعض علاقوں یا ختن کے صحراؤں کے سوا کہیں نہیں ہوتا۔

"جی بہت۔" خضر خان نے پُر زور لہجے میں کہا۔

"اچھا۔۔۔؟" عاقل کو جیسے اب بھی یقین نہ آیا۔

"یہ دیکھیے کستُوروں کے حنوط کیے ہوئے سر۔" خضر خان نے دیوار پر لٹکے ہوئے

ہرن کے سروں کی طرف اشارہ کیا۔ ”میرے پاس پورے کے پورے نافے محفوظ ہیں۔“

”نافے کیا ہوتے ہیں بھائی جان؟“ اعظم نے پُوچھا۔

”ایک خاص قسم کے ہرن، جسے کستورا کہتے ہیں، کی ناف میں ایک چھوٹی سی تھیلی ہوتی ہے۔ اسی کو نافہ کہتے ہیں۔ اس کے اندر ایک نہایت خوشبودار مادہ ہوتا ہے۔“ عاقل نے بتایا۔

”تو خان صاحب کے پاس ہیں وہ نافے؟“ اعظم نے حیرت سے پوچھا۔ ”ہاں ہمارے پاس کئی خُشک نافے موجود ہیں۔ دکھائیں تمہیں؟“ خضر خان نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

”جی ضرور۔۔۔۔ شکریہ۔“ عارف بولا۔

خضر خان کمرے کے ایک کونے میں پہنچا اور ایک طاق میں سے بڑا سا صندوق اُٹھا لایا۔ اعظم لپک کر پہنچا اور اس کے ہاتھوں سے وہ وزنی صندوقچہ خود لے کہ اس

کے ساتھ واپس آیا اور اسے سب کے سامنے قالین پر رکھ دیا۔ آبنوس کی لکڑی کا یہ صندوقچہ نقّاشی کا ایک نادر نمونہ تھا۔

"یہ صندوقچہ میرے ایک دوست نے تحفے کے طور پر دیا تھا۔ اگر آپ کستورا ہرن کے شکار کا پروگرام بنائیں تو میں اس سے آپ کو ملا دوں گا۔ وہ شکار اور ان جانوروں کی عادتوں سے خوب واقف ہے۔ اس کے علاوہ مہمان نوازی میں تو وہ اپنے وقت کا حاتم ہے۔ اس کی رہائش گاہ 'جباریہ' ایک قابلِ دید مقام ہے۔ کئی مربع زمین کے رقبے میں عجیب و غریب چمن ہیں جن کے درمیان اس کا شاہانہ محل کھڑا ہے۔ اور اس محل میں بیسیوں مہمان ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ خدمت کے واسطے خادم اور کنیزیں مقرر ہیں۔"

مہمان مُشک نافہ دیکھنے کو بے تاب تھے مگر میزبان اپنے دوست کی قصیدہ خوانی میں لگ گیا۔ آخر اس نے نے صندوقچہ کھولا اور چمڑے کے تھیلے میں سے دو نافے نکال کر انہیں دکھائے۔ یہ سیاہ رنگ کی چھوٹی چھوٹی تیلیاں تھیں اور ان میں سے بہت تیز اور بوجھل سی خوشبو آرہی تھی جو مہمانوں کو اچھّی لگنے کے بجائے ناگوار

محسوس ہوئی۔

"بہت تیز خُوشبو ہے۔" قاسم کہنے لگا۔

"اگر ہرن کے جسم سے نکالتے ہی تازہ نافہ کھول دیا جائے تو اتنی تیز خوشبو ہوتی ہے کہ ناک سے خون بہنے لگتا ہے۔" خضر خان نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں کو اور بھی پھاڑتے ہوئے کہا۔

عاقل نے تھیلیوں کو بڑے غور سے دیکھا اور اب مُعلوم ہوتا تھا کہ اسے اپنے میزبان کی باتوں کا یقین ہو گیا ہے۔

"عجیب چیز ہے؟" اس نے وہ تھیلیاں واپس دیتے ہوئے سر ہلایا۔

"یہ تھیلی نافوں سے بھری ہوئی ہے۔ جب آپ تشریف لے جائیں گے تو اس ملاقات کی نشانی کے طور پر میں ایک ایک نافہ آپ کو پیش کروں گا۔" خضر خان چمڑے کی تھیلی کا منہ لپیٹتے ہوئے بولا۔

"ہم تو صُبح ہی روانہ ہو جائیں گے؟" قاسم نے کہا۔

”اوں ہوں۔ غلط، میں تو آپ کو کئی دن مہمان رکھوں گا۔ پھر اپنے دوست جابر خان کے ہاں لے جاؤں گا۔ میں چاہتا ہوں اس طرف اتفاقیہ آنکلنا آپ کے لیے زندگی کی ایک یادگار مُہم بن جائے۔“ خضر خان نے بڑے زوردار لہجے میں کہا۔

”کیوں کیا خیال ہے۔۔۔؟“ قاسم نے عاقل سے پوچھا۔ عاقل ابھی کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ خضر خان خود ہی بول اٹھا۔

”جی بس طے ہے۔۔۔ مُجھے بھی تفریح کا موقع مل جائے گا۔ اکیلے نکلنے کو جی نہیں چاہتا۔ مدّت سے کوئی دوست نہیں آیا تھا جس کے ساتھ مل کر پروگرام بنایا جاتا۔ آپ کے طفیل میں بھی چار دن عیش کروں گا۔“

اس کے اصرار پر عاقل کو بھی بات کرنی پڑی۔ شاندار خان پوچھنے لگا۔ ”تو ساب، مجھے صُبح رُخصت کر دیں۔ میری تو اب ضرورت نہیں۔ خضر خان آپ کے ساتھ ہوں گے۔“

”ہاں ہاں۔ تم صُبح بے شک واپس چلے جانا۔ میں خود ان کی واپسی کا انتظام کر دوں گا۔“ خضر خان بول اُٹھا۔

"جب تک کھانا آئے میں آپ کو چند عجوبے دکھاؤں؟" خضر خان نے پوچھا۔

"بڑے شوق سے۔" عاقل نے کہا۔ پرانے عجوبے اور نوادرات بھی اس کی دل چسپی کی چیز تھی۔ خضر خان نے ایک تھیلی کھول کر فرش پر الٹ دی۔ سِکّوں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر لگ گیا۔

"یہ مختلف ملکوں کے چار صدی پرانے سکّے ہیں۔" وہ کہنے لگا اور مہمان سکّے اُٹھا اُٹھا کر دیکھنے لگے۔ پھر اس نے صندوقچے کا اوپر کا خانہ اُٹھایا تو نیچے کا تمام حصّہ چمکتی ہوئی اشرفیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اب اعظم کو اس کے اتنا بوجھل ہونے کا راز معلوم ہوا۔ اس حصّے میں سے خضر خان نے چاندی کی ایک منقّش ڈبیا نکال کر اس کا ڈھکنا اٹھایا تو جواہرات کی چمک سے چکا چوند پیدا ہو گئی۔ خاصے بڑے بڑے ہیرے، فیروزے، زمرّد، یاقوت اور عقیق تھے جن میں سے ہر ایک کے متعلق کوئی نہ کوئی تاریخی قصّہ اس نے بیان کیا۔ ایک یاقوت نوشیروان عادل کے تاج میں رہ چکا تھا تو ایک فیروزہ رُستم کے گُرز گاؤ سر میں سے اس وقت گر پڑا تھا جب وہ اپنے بیٹے سُہراب کے ساتھ جنگ کر رہا تھا۔ اسی طرح چند زمرّد اور ہیرے

تختِ طاؤس کی زینت رہ چکے تھے۔ میزبان کے بیان پر مہمانوں کو یقین تو نہ آیا مگر اسے خُوش کرنے کے لیے وہ حیرت کا اظہار کرتے رہے۔

اتنے میں تین چار خادم بڑے بڑے خوان اُٹھائے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ دستر خوان بچھایا گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ قلندر اپنے فن میں پوری مہارت رکھتا ہے۔ اسے تھوڑے وقت میں اُسی نے کئی قسم کے لذیذ کھانے تیار کر لیے تھے۔ مہمانوں نے بڑی رغبت سے کھانا شروع کیا اور قلندر تعریف سُن سُن کر خوش ہوتا رہا۔

طُرّے باز خاں مارا گیا

صبح جب آنکھ کھلی تو خادم وضو کرانے کے لیے گرم پانی کے آفتابے لیے منتظر بیٹھے تھے۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی پیغام پہنچا کہ آقا ناشتے پر انتظار کر رہے ہیں۔ وہ چاروں اپنی خواب گاہ سے نکل کر اُسی رات والے ایوان میں داخل ہوئے۔ خضر خان مسند کے اوپر گاؤ تکیے لگا بیٹھا تھا۔ سامنے لمبا چوڑا دستر خوان بچھا تھا جس پر کئی قسم کی چیزیں موجود تھیں۔ مہمانوں کو دیکھتے ہی اس نے بڑے تپاک سے ان کی خیریت پوچھی اور ناشتا کرنے کو کہا۔ وہ سب اس کے اخلاق اور مہمان نوازی سے متاثر تھے۔ عاقل نے موزوں لفظوں میں اُس کا شکریہ ادا کیا اور سب

دستر خوان کے گرد بیٹھ گئے۔ قاسم نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑا کر پوچھا۔

''وُہ شان دار خاں کہاں ہے؟''

''وُہ تو صُبح ہی روانہ ہو گیا۔ کہتا تھا دن چڑھتے چڑھتے واپس پہنچ کر کوئی اور اسامی ڈھونڈ لے گا۔ چنانچہ سواری کے جانور لے کر چلا گیا۔'' خضر خان نے جواب دیا۔

''مگر وہ ہم سے اپنی اُجرت تو لے کر جاتا۔۔۔'' عاقل نے ایک دم چونک کہ سر اُٹھایا۔

''ایسا تو ممکن نہ تھا کہ وہ اجرت کے بغیر چلا جاتا۔ آپ تسلّی رکھیں۔ میں نے اسے منہ مانگی رقم دے دی ہے اور وہ خوش ہو کر گیا ہے۔ آپ کو سلام کہتا تھا۔''

''اوہو، پھر تو ٹھیک ہے۔ آپ نے کتنی رقم دی ہے؟ وہ میں آپ کو شکریے کے ساتھ ادا کر دوں گا۔'' عاقل نے کہا۔

''اگر مجھے یہ رقم آپ سے واپس لینی ہوتی تو آپ کی اجازت سے دیتا۔۔۔ یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں جس کے لیے آپ پریشان ہوں۔ میں کبھی آپ نے ہاں

آؤں گا تو اس سے کہیں زیادہ آپ سے خرچ کراؤں گا۔"

"وہ تو بسر و چشم، مگر میرے مہربان میزبان، مہمان کو اس قدر بھی زیر بار نہیں کرنا چاہیے کہ وہ شرمندہ ہو جائے۔" عاقل کہنے لگا۔

"ہرگز نہیں، میں شرمندہ ہونے والی ہستی نہیں ہوں۔ آپ مجھے جس قدر چاہے زیر بار کرتے رہنا۔۔۔۔ ایک دفعہ پہنچ جاؤں آپ کے ہاں۔۔۔۔"

خضر خان نے قہقہہ لگا کر عاقل کی بات کو مذاق میں لے جانا چاہا۔ عاقل نے بات ہی ایسی کہہ دی تھی کہ جس نے دو معنی نکل سکتے تھے۔ اپنے میزبان کی خوش مزاجی پر چاروں مہمانوں نے بھی بے اختیار ہنسنا شروع کر دیا۔

"ماشاء اللہ، آپ بڑے زندہ دل ہیں۔" قاسم نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ دونوں لڑکوں کے چہرے بھی خوشی سے کھل رہے تھے۔

"جی ہاں صاحب، زندہ رہنے کے لیے تو زندہ دِل ہونا ہی چاہیے۔ ورنہ مُردہ دل خاک جیا کرتے ہیں؟"

اور اس طرح خضر خان نے بات کو مذاق میں ٹال دیا اور مہمانوں سے ان کے رہنما کی اُجرت لینے پر آمادہ نہ ہوا۔ ناشتا ختم ہوا تو خضر خان نے تجویز پیش کی:

"چلیے آپ کو سیر کرا لائیں اور پھر تھوڑی سی قازیں مار لائیں۔"

"قازیں ہوتی ہیں اس علاقے میں؟" قاسم نے پوچھا۔

"اس موسم میں تو بہت ہوتی ہیں۔ لیکن سردیاں شروع ہوتے ہی میدانی علاقوں میں چلی جاتی ہیں۔"

اس تجویز پر سب بے حد خوش ہوئے اور اپنی اپنی بندوقیں کندھے پر رکھ کر خضر خان کے ساتھ چل دیے۔ یہ علاقہ پہاڑوں کے دامن میں تھا۔ چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ دکھائی دیتا تھا۔ سرسبز پہاڑوں کی بلندی پر سے پھسلتے ہوئے پہاڑی نالے چاندی کے سانپوں کی طرح بل کھاتے ہوئے ایک چھوٹی سی جھیل میں گرتے تھے۔ پانی کی آواز پہاڑوں میں ایسی میٹھی اور سُہانی گونج پیدا کرتی تھی جیسے کوئی ساز بج رہا ہو۔ چمکیلی دھوپ میں نہائی ہوئی نِکھری نِکھری فضا، اس پر گہرے نیلے رنگ کا دُھلا دُھلا سا آسمان۔ یہ دل کو لُبھانے والا منظر دیکھ کر سب

بے حد خوش ہوئے۔ اتنے ہی میں قازوں کا ایک بڑا سا جھُنڈ پہاڑ کی چوٹی پر فضا میں تیرتا نظر آیا۔

"اب یہ جھیل کے کنارے اُتریں گی۔" خضر خان کی باچھیں کھل گئیں اور جیسا کہ اس نے کہا تھا قازوں کی ایک بہت بڑی ٹکڑی نے نیچے کا رُخ کیا۔ مگر وہ جھیل کے دوسرے کنارے پر اُتر گئی۔

"افّوہ، کم بختیں اس طرف جا بیٹھیں۔ اِدھر آتیں تو مزا رہتا۔" خضر خان کہنے لگا۔

"اس کنارے پر جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے؟" قاسم نے پوچھا۔

"راستہ تو ہے مگر بہت لمبا اور دشوار چکّر ہے۔ بچّے ہمارے ساتھ نہ ہوتے تو میں آپ کو لے جاتا۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہم چڑھائی سے نہیں گھبراتے۔ ہماری وجہ سے آپ اپنا شکار خراب نہ کریں۔" اعظم بولا۔

" ہم تو شوق سے آپ کا ساتھ دیں گے۔" عارف جوش سے بولا۔

خضر خان نے تعریف کی نظروں سے دونوں لڑکوں کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔
" آپ کی بہادری قابلِ تعریف ہے میرے ننھے دوستو، قازیں تو اس طرف بھی آ ہی جائیں گی۔ لیکن شکار کا اصلی لطف اُسی صورت میں حب اسے مُہم کا درجہ مل جائے۔ اگر آپ دونوں دوست تکلیف محسوس نہ کریں تو چلیے۔ بسم اللہ۔"

خضر خان نے اپنا شکاری تھیلا کندھے پر ڈالا اور راستہ دکھانے کو آگے آگے ہو لیا۔ جھیل کے کنارے کنارے وہ چٹانوں پر چڑھنے لگے اور پھر ایک بڑی پہاڑی کے گرد چکّر کاٹ کر وہ گھاٹی میں اترے۔ یہ کافی چوڑی گھاٹی تھی۔ اس کے آدھے حصّے میں ایک برساتی پہاڑی نالہ تھا اور آدھا حصّہ جو نالے کے کنارے سے ذرا اونچا تھا، اس کے ساتھ ساتھ جھیل کے کنارے تک چلا گیا تھا۔ مگر یہ نالہ خاصی اُونچائی سے جھیل میں گرتا تھا۔ ان لوگوں کو جھیل تک پہنچنے کے لیے ڈیڑھ میل کے قریب نالے کے ساتھ ساتھ چلنا پڑا مگر دہانے کے قریب وہ اپنا راستہ بدلنے پر مجبور ہوئے کیونکہ نالے کے ساتھ وہ جِھیل کے اندر نہیں گِرنا

چاہتے تھے۔

اب وہ پھر ایک ٹوٹی پھوٹی چٹان پر چڑھنے لگے۔ اس کی چوٹی خاصی ہموار تھی۔ ہاں پتھّروں میں عجیب و غریب شکل کی پتّیاں جھانک رہی تھیں اور رنگ رنگ کے خودرو پھول بھی کھلے ہوئے تھے۔ اعظم اور عارف پتّیاں توڑ توڑ کر جمع کرنے لگے۔

"ان پتّیوں کا کیا کروگے دوستو؟" خضر خان پوچھنے لگا۔

"کتابوں میں رکھیں گے اور اپنے دوستوں کو تحفہ دیں گے۔" عارف نے جواب دیا۔

"کتابوں میں۔" خضر خان نے جیسے کُچھ نہ سمجھتے ہوئے پُوچھا۔

"جی ہاں، انہیں کتابوں کے ورقوں میں رکھ دیتے ہیں تو یہ خُشک ہو کر بہت پیاری لگتی ہیں۔"

"اچھا۔۔۔" خضر خان بولا اور وہ کُچھ کہنے کو تھا کہ ایک دم چونک کہ بندوق

سنبھالتے ہوئے سامنے والی چٹان کی طرف فائر کیا۔ پھر جھک کر نیچے دیکھنے لگا۔

"بڑے مزے کا خرگوش مارا ہے۔ مگر جلدی کیجئے بدبخت نے ہمارے پہنچنے سے پہلے دم توڑ دیا تو حرام جائے گا۔"

اپنے بھاری بھرکم جسم کے باوجود خضر خان خاصا پھُرتیلا آدمی تھا۔ وہ لپکتا ہُوا نیچے اُترنے لگا۔

"کہاں ہے خرگوش۔" عاقل نے پوچھا۔

"گولی کھا کر نیچے بھاگا ہے۔ راستے ہی میں پڑا مل جائے گا۔۔۔ یہ پگڈنڈیاں ہمیں سیدھی جھیل کے کنارے لے جائیں گی۔" خضر خان کہہ رہا تھا اور ساتھ ہی اُچک اُچک کر اپنے بھاری جسم کو پیچھے دھکیل رہا تھا۔ انہوں نے آدھا راستہ طے کیا ہو گا کہ ایک دم عاقِل نے فائر کیا۔ سامنے والی پہاڑی کی ایک گُپھا میں اسے ایک سفید برّاق خرگوش دکھائی دیا تھا اس کے ساتھ ہی قاسم اپنا لمبا شکاری چاقو لے کر نیچے کُود پڑا اور خرگوش کو ذبح کر ڈالا۔

”چلیے ایک خرگوش تو محفوظ ہو گیا۔ آپ کا خرگوش تو مر چُکا ہو گا ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی۔۔۔“

قاسم نے خرگوش کو اُٹھا کر خضر خان کی طرف بڑھایا۔ خضر خان نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے شکار کا جائزہ لیا اور بولا:

”خوب فربہ جانور ہے۔“ اُس کے منہ میں ابھی سے پانی بھر آیا تھا۔ اب وہ جھیل سے چند گز اُوپر چٹانوں پر کھڑے تھے۔

”آپ سب ایک لمحہ یوں ہی کھڑے رہیں۔ میں آپ کی تصویر اُتاروں گا۔“ عارف اپنا کیمرہ درست کرتے ہوئے کہنے لگا۔ اس کی فرمائش پر سب بڑے شوق سے تصویر اُتروانے کے لیے تیّار ہو گئے۔ جب تصویر اُتاری جا چکیں تو اعظم نے بھوک کا اظہار کیا۔ خِضر خاں نے اپنے گھوڑے سے بندھا ہوا کھانے کا تھیلا اتارا اور سب لوگ جھیل کے شفاف پانی میں ہاتھ دھو کر سب کھانے کے لیے بیٹھے۔

”کسی خادم کو ساتھ لے آتے تو وہ خرگوش کو یہیں بھون لیتا۔“ خضر خان موٹے تازے خرگوش کو ابھی کھانا چاہتا تھا اور ایسا ممکن نہ ہونے پر اسے افسوس ہو رہا

تھا۔ وہ لوگ کھانا کھا کر اُٹھے ہی تھے کہ فضا میں پھڑ پھڑاہٹ کی آواز ہوئی۔ سب نے چونک کر اُوپر دیکھا۔ قازوں کی ایک بہت بڑی ٹکڑی اُن کے سروں پر تیر رہی تھی۔ خضر خان کے اشارے پر وہ دبے پاؤں جھاڑیوں کی طرف بڑھے اور اُن کے پیچھے چھُپ گئے۔ مگر یہ دیکھ کر اُن کی مایوسی کی اِنتہا نہ رہی کہ وہ پُورے کا پُورا جھُنڈ جھیل کی سطح پر سے گُزر کے دوسرے کنارے جا اُترا ہے۔

"یہیں بیٹھے رہیے۔ ان کے پیچھے اور قازیں آ رہی ہوں گی۔ ہمیں اس جگہ موجود پا کر انہوں نے خطرہ محسوس کیا اور آگے نکل گئیں۔" خضر خان یہ کہہ ہی رہا تھا کہ ناگاہ فضا میں فائر کی آواز گونجی۔

"دوسرے کنارے پر کوئی اور شکاری آ پہنچا ہے۔"

اب وہ قازیں یقیناً اس کنارے پر آئیں گے۔"

خضر خان پُر اُمّید لہجے میں بولا۔ فائر کی آواز اگرچہ دُور سے آئی تھی مگر اس سے جو ہلچل مچ گئی اس کا اثر اِس کنارے پر نمایاں تھا۔ قازوں کے جھُنڈ خوف زدہ ہو کر اڑ گئے اور فضا میں چکّر کاٹنے لگے۔ خیال تھا کہ قازیں کنارے پر اُترنے کے

بجائے اپنے کوہستانی بسیروں کا رُخ کر دیں گی۔ لیکن وہ لوگ اپنی کمین گاہ میں بیٹھے اُن کے اترنے کا انتظار کرتے رہے۔ آخر ان میں سے ایک دس بارہ کی ٹکڑی نے فضا میں غوطہ لگایا اور نیچے کا رُخ کیا۔

"شکر ہے۔ وہ نیچے آرہی ہیں۔" عارف بولا۔

"میرے دوست، تم چُپکے ہی سے سجدے میں گر جاؤ تو بہتر ہے۔ اتنے زور سے شکرانہ ادا کروگے تو وُہ ڈر کر ہوا ہو جائیں گی۔" خضر خان نے سرگوشی میں کہا۔

اتنے میں قازیں جھیل کے کنارے پر اُتر آئی تھیں اور کچھ کم گہرے پانی میں کھڑی، کیڑے مکوڑے تلاش کر رہی تھیں۔

"ایک ہی فائر میں جتنی مار لیں بس مار لیں۔۔۔ اس لیے ہمیں ایک دم فائر کرنا چاہیے۔"

خضر خان نے تجویز پیش کی اور اُس کے اشارے پر عاقل اور قاسم نشانہ باندھنے لگے۔

”بھائی جان! ہم بھی؟“ عارف نے پوچھا۔

”ہاں بے شک۔ تم دونوں بھی اپنے ہتھیاروں کو آزماؤ۔“

عاقل نے شفقت سے اس کے سر پہ تھپکی دے کر کہا اور اگلے ہی لمحے بندوقوں کی باڑھ کی آواز سے پہاڑیاں گونج اُٹھیں۔ کچھ قازیں زخمی ہو کر پھڑ پھڑانے لگیں۔ کچھ جان بچا کر اُڑنے میں کامیاب ہو گئیں۔ خضر خان نے اُڑتی ہوئی ایک چھوٹی سی ٹکڑی پر پھر فائر کیا تو اس میں سے بھی تین چار زخمی ہو کر گریں۔ مگر وہ پانی میں ِگری تھیں۔ خضر خان نہایت پھرتی سے پانی میں اُتر گیا اور چار قازوں کو پکڑ کر کنارے پر لے آیا۔

”آپ نے تو خوب پھُرتی دکھائی خان صاحب۔“ عاقل نے داد دیتے ہوئے کہا۔ وہ قاسم کے ساتھ مل کر قازوں کو ذبح کر رہا تھا۔ ”ورنہ چار قازیں ضائع جاتیں۔“

”وہ شکاری ہی کیا جو اپنے شکار کو ضائع ہو جانے دے۔“ خضر خان نے فخر سے تن کر جواب دیا۔ ”اور وہ۔۔۔۔ خرگوش؟ خان صاحب۔“ عظمیٰ نے شرارت سے

کہا اور خضر خاں کو وہ خر گوش یاد دلایا جسے وہ ذبح نہ کر سکا تھا۔

”وہ تو ذبح کرنے سے پہلے ہی مر گیا۔ اب حرام گوشت تو کھا نہیں سکتے تھے اس لیے اسے چھوڑ دیا۔“ خضر خان نے بھی اپنے ساتھیوں کا ہاتھ بٹایا اور جلد ہی وہ اپنے شکار کو تھیلوں میں بھر کر روانگی کے لیے تیّار ہو گئے۔

”اب تو خوش ہو میرے دوستو، رات کو تمھیں قلندر کے ہاتھ کی پکی ہُوئی قازیں کھلائیں گے۔ ان سے وہ ایسا لذیذ دم پُخت بنائے گا کہ آپ بے حد پسند کریں گے۔“ خضر خان عارف اور اعظم سے کہہ رہا تھا۔ اچانک جھیل کے دوسرے کنارے پر کچھ آدمی نظر آئے۔

”یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اُدھر سے فائر کیا تھا۔“ قاسم نے اُس طرف اشارہ کیا۔ آدمی جھیل کے کنارے پر کھڑے ہوئے اُسی طرف دیکھ رہے تھے۔ عاقل نے دیکھا تو اُسے کُچھ شُبہ ہُوا۔ اُس نے فوراً دُور بین لگا کر دیکھا اور پھر بولا:

”یہ تو وہی طُرّے باز خان اور اس کے ساتھی ہیں۔“

”اچھّا! آخر اِن بد بختوں نے ہمارا کھوج لگا ہی لیا۔“ قاسم کہنے لگا۔

”شان دار خان نے انہیں بتا دیا ہو گا۔“ اعظم نے کہا۔

”نہیں بیٹا، ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ شان دار خان ایسا آدمی نہیں ہے۔ وہی تو انہیں چکّر میں ڈال کر آپ لوگوں کو اس طرف لایا تھا۔“ خضر خاں نے کہا۔

”خیر، اِن سے نپٹنا پڑے گا۔“ عاقل نے غصّہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”آپ نپٹنا کہہ رہے ہیں، میں کہتا ہوں انہیں موت گھیر کر خضر خان کے راستے میں لے آئی ہے۔ میرے مہمانوں کے ساتھ یہ کُتّے کُچھ زیادتی کرنے کا خیال کریں، ان کی یہ مجال؟“

خضر خان مارے غصّے کے سُرخ ہو گیا اور تیزی سے آگے بڑھا۔ واپسی کا زیادہ راستہ اُترائی کا تھا اِس لیے وہ لوگ پہلے کی نسبت کم وقت ہیں جھیل کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ لیکن ایک دم کھُلی جگہ پہنچنے کے بجائے خضر خان انہیں ایک ایسی چٹان کے اُوپر لے گیا جو عین اس مقام کے اُوپر تھی جہاں سے طُرّے

باز خان اور اس کے ساتھی دھوپ میں گھاس پر لیٹے ہوئے سستا رہے تھے اور ساتھ ہی ان کی واپسی کا اِنتظار بھی کر رہے تھے۔

انہیں معلُوم تھا کہ وہ لوگ اسی راستے سے واپس آئیں گے۔ خضر خان کی تجویز پر عاقل نے چٹان کی چوٹی پر سے للکار کر انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ قاسم اور دونوں لڑکے ایسی جگہ چھُپ گئے تھے جہاں سے وہ آسانی سے اُن پر فائر کر سکتے تھے۔ خضر خان خود عاقل کے پیچھے کھڑا ہو گیا تھا۔

"اے، تم لوگ کس غرض سے ہمارے پیچھے آئے ہو؟" عاقل نے للکار کر پوچھا۔ اس پر وہ سب چونک کر اوپر دیکھنے لگے۔ طُرّے باز خاں سویا ہوا تھا۔ مگر آواز سُن کر وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھا اور بندوق اُٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

"تمہیں اس کی وجہ اچھی طرح معلوم ہے۔ پھر کیوں پوچھتے ہو؟ ہم لوگ بغیر غرض کے تو رات بھر خوار نہیں ہوئے۔" اس نے ٹوٹی پھُوٹی اردو زبان میں جواب دیا۔

"چلو م مجھے معلوم نہیں۔ تم مُجھے بتاؤ کہ کسی غرض سے تم خوار ہوتے پھرے؟"

خضر خان نے عاقل کے برابر آتے ہوئے پُوچھا۔

"نیچے آکر بات کرو۔ وہاں اُوپر کیا ٹنگے ہوئے کھڑے ہو؟" طُرّے باز خاں بولا۔
اس مرتبہ اس نے اپنی زبان میں بات کی۔

"ہمیں کیا ضرورت ہے نیچے آنے کہ۔ ہم اسی طرف سے اُتر کر گھر چلے جائیں گے۔" خضر خان نے کہا۔

"تم ہمارا شکار چھیننے کی جرأت نہ کرو خضر خان۔" طُرّے باز خاں نے للکار کر کہا۔

"اچھا تو یہ لوگ تمہارا شکار ہیں؟" خضر خان نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"بے شک۔" اس نے اکڑ کر کہا۔ "انہیں شرافت سے ہمارے حوالے کر دو۔ ہاں، اگر کوئی شرط طے کرنا چاہو تو بتا دو۔"

"میں ان لوگوں کو دوست کہہ چکا ہوں۔ یہ میرے مہمان ہیں۔ میں کسی شرط پر بھی انہیں تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔ شام سے پہلے پہلے میرے علاقے سے نکل جاؤ ورنہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔" خضر خان نے اُسے دھمکایا۔

” سبحان اللہ۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ تمہارے کیسے دوست ہیں۔“طُرّے باز خاں کہنے لگا۔

”بتاؤں تمہیں کیسے ہیں؟“خضر خان نے جوش میں آکر کہااور ساتھ ہی اس نے تڑ سے فائر داغ دیا۔ دو گولیاں پے در پے طُرّے باز خاں کے سینے میں لگیں اور وہ چکرا کر ِگرا۔ دوسرے دونوں آدمی پہاڑی کے نیچے اوٹ میں ہو گئے۔

”جانے نہ پائیں۔ ورنہ یہ واپس جا کر فتور مچائیں گے۔“ خضر خان نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

قاسم کو پہلے ہی اس بات کا شُبہ تھا کہ طُرّے باز خاں کے ساتھی پناہ لینے کے لیے ایسا ہی کریں گے۔ وہ اُچک کر پہلو والی چٹان پر جا پہنچا تھا۔ اس نے دونوں آدمیوں کو زخمی کر دیا۔ مگر جان سے نہ مارا۔ دونوں کی ٹانگیں بیکار ہو گئی تھیں۔یہ لوگ اُتر کر نیچے آئے تو طُرّے باز خاں کے ساتھی ِگڑ ِگڑا کر امان مانگنے لگے۔ عاقل اور قاسم کو ان پر ترس آگیا مگر خضر خان کسی طرح بھی اُن کی جان بخشی پر تیار نہ تھا۔”آپ کو معلوم نہیں یہ کس قسم کے لوگ ہیں۔واپس جا کر یہ ہمارے

خلاف کارروائی کریں گے۔"

یہ کہہ کہ اس نے دونوں کو گولیوں سے بھون دیا اور تینوں کو گھسیٹ کر جھیل میں پھینک دیا۔

"مچھلیاں بھوکی ہوں گی۔ آج وہ خُوب دعوت اُڑائیں گی۔" خضر خاں نے ہنستے ہوئے کہا۔

دونوں لڑکے سہم گئے تھے۔ قاسم اور عاقل بھی چُپ چُپ سے تھے۔ یکایک تین انسانی جانیں ان کے سامنے چند لمحوں میں ختم ہو گئی تھیں۔ یہ کوئی قابلِ دید منظر نہ تھا۔ مگر خضر خان کے چہرے پر ملال کا ذرا سا سایہ بھی نہ تھا۔ واپسی پر وہ انہیں ہنسنے بولنے پر آمادہ کرتا رہا مگر وہ خاموشی سے چلتے رہے۔

"دوستو، یہ کیا مذاق ہے کہ آپ اپنے دشمنوں کی موت پر رنجیدہ ہو گئے۔" وہ پوچھنے لگا۔

"وہ لوگ ہماری جان کے درپے تو تھے مگر ان کی موت کا منظر ہمیں اچھا نہیں

لگا۔ بہتر ہوتا کہ آپ انہیں ڈرا کر بھگا دیتے۔" عاقل نے کہا۔

"میں نے بہت کچھ کہا تھا۔ آپ ہماری زبان سمجھ سکتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا۔ مگر وہ کسی طرح بھی واپس جانے پر آمادہ نہ ہوا۔ بلکہ مجھے بھی اپنے ساتھ شامل ہونے کی دعوت دینے لگا۔ اس پر مجھے غصّہ آ گیا۔ وہ لوگ آپ کو چھوڑنے والے نہ تھے۔"

گھر پہنچتے پہنچتے عصر کا وقت ہو گیا۔ سب نے عصر کی نماز پڑھی اور اپنے اپنے کمرے میں سستانے کو لیٹ رہے۔

ڈاکوؤں سے مُڈ بھیڑ

اگلی صُبح عاقل نے اپنے ساتھیوں کے مشورے سے واپسی کا پروگرام بنایا۔ وہ لوگ تین آدمیوں کی موت دیکھ کر بد مزہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے کستورے ہرنوں کے شکار کا پروگرام منسوخ کر دیا اور وہ اپنے میزبان کی تواضع اور مہمان داری کا شکریہ ادا کر کے اس سے رُخصت کی اِجازت مانگنے لگے۔ اس پر خضر خان بُہت اداس اور بد دل نظر آنے لگا اور افسوس ناک صورت بنا کر کہنے لگا:

"اچھا دوستو، اگر آپ کا دل اُچاٹ ہو گیا تو میں مجبور نہیں کرتا۔ لیکن اتنا ضرور یاد رکھنا کہ جن بدبختوں کی موت پر آپ کی طبیعت بے لطف ہو گئی وہ اگر زندہ بچ

رہتے تو آپ کا ایسا حشر کرتے کہ آپ اُس حالت پر مرنے کو ترجیح دیتے۔ میں نے آپ کی حفاظت کے لیے انہیں مار ڈالو ورنہ ان سے میری کوئی دُشمنی نہیں تھی۔"

خِضر خاں کی اس بات سے قاسم کے دل پر بُہت اثر ہوا۔ عُرفی اور عظمی بھی ایسے اچھے سیر و شکار کے پروگرام کے منسوخ ہو جانے پر اداس ہو گئے تھے۔ وہ اُمّید بھری نظروں سے عاقل کی طرف دیکھنے لگے کہ شاید وہ اب بھی اپنا ارادہ بدل دے۔

"ہمیں خود افسوس ہے کہ آپ کا تجویز کیا ہوا سیر و شکار کا ایسا اچھا پروگرام رہ گیا۔" عاقل کہنے لگا۔

"تو ٹھہر جایئے نا۔ دیکھیے بچے بھی آزردہ ہو گئے ہیں اور میں اِس ویرانے میں پڑا پڑا ازِچ ہو گیا تھا۔ آپ کے چلے آنے پر توقع ہوئی تھی کہ چند دن اچھے کٹ جائیں گے۔"

خِضر خان نے کُچھ ایسے لہجے میں کہا کہ خود عاقل کو بھی اس پر ترس آ گیا۔ اِدھر

قاسم نے سفارش کی تو دونوں لڑکے بھی اس کی تائید کرنے لگے۔

"آپ کو ہمارے جانے کا اتنا افسوس ہے تو لیجیے ٹھہر جاتے ہیں۔" عاقل نے کہا۔ عُرفی اور عظمی تالیاں بجائے لگے۔ خِضر خان نے مارے شکر گزاری کے عاقل کو گلے سے لگا لیا اور بے حد خوش ہوا۔ اس نے تین روز ان لوگوں کو اپنے ہاں مہمان رکھا اور چوتھے روز یہ لوگ روانہ ہوئے۔ قلندر نے رات ہی کو کھانا تیّار کر کے ایک بڑے ناشتے دان میں بھر دیا تھا۔ کیونکہ ان لوگوں کو کہیں پہر رات گئے منزل پر پہنچنا تھا اور دونوں وقت کا کھانا راستے ہی میں کھانا تھا۔

مشرق کی سمت، صُبح صادق کا دودھیا نُور پھُوٹ رہا تھا۔ کوہستانی فضا میں برفیلی ہوائیں سنسنا رہی تھیں۔ چاروں مُسافر لمبی پوستینوں میں لپٹے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ عاقل اور قاسم خضر خان کے اصطبل کے بہترین گھوڑوں پر سوار تھے۔ عارف اور اعظم کے لیے تیز رفتار پہاڑی یابُو مہیّا کیے گئے تھے جو دوڑنے میں اِن گھوڑوں سے پیچھے نہیں رہتے تھے۔

دن چڑھتے چڑھتے وہ ایک تنگ درّے میں سے گُزر کے میدانی علاقہ میں پہنچے۔

اُونچے اُونچے پہاڑوں کے دامن میں پھیلی ہوئی سر سبز چراگاہیں دور تک چلی گئی تھیں۔ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ جابجا چرتے پھر رہے تھے۔ پہاڑی لڑکے پوستین کی صدریاں اور سرکنڈوں کی چھال کے جوتے پہنے چونچال رفتار سے اپنے اپنے ریوڑ لیے ہوئے قریبی دیہاتوں سے چراگاہ کی طرف چلے آ رہے تھے۔ یہ لوگ قریب سے گزرتے تو وہ انہیں حیرت سے دیکھتے۔ ایک دو نے پُوچھ بھی لیا کہ کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ اور جب خِضر خان نے اُن کی زبان میں جواب دیا تو وہ مطمئن ہو کر اپنی راہ چل دیے۔

دھوپ میں ایسی خوش گواری کبھی محسوس نہ ہوئی تھی جو اس وقت ہوئی۔ ٹھٹھرے ہوئے ہاتھ پاؤں میں جان پڑ گئی۔ طبیعت میں شگفتی آ گئی اور مسافر اب گاہے گاہے آپس میں باتیں کرنے لگے۔

دوپہر ہوتے ہوتے یہ لوگ سر سبز چراگاہوں کو عبُور کر گئے اور اس پار دُور سے سُرمئی بادلوں کی طرح دِکھائی دیتی ہوئی چٹانوں کے دامن میں جا پہنچے۔ اِس جگہ وہ ایک پہاڑی جھرنے کے کنارے اُتر پڑے۔ جانوروں کو پانی پلایا اور چرنے کے

لیے چھوڑ دیا۔ خود گھاس پر دستر خوان بچھا کر دوپہر کا کھانا کھایا۔ خِضر خاں ستانے کے لیے لیٹ گیا۔ عاقل اور قاسم اس کے قریب بیٹھ کر باتیں کرنے لگے اور دونوں لڑکے جھرنے کے کنارے کنارے سیر کرتے دُور نِکل گئے۔ جب وہ اُس جگہ پہنچے جہاں پہاڑیوں کے پیچ در پیچ راستوں کو کاٹتا ہوا یہ چھوٹا سا پہاڑی جھرنا کوئی دس فٹ کی اُونچائی سے ایسے گِرتا تھا تو انہیں اس ننھّی سی آبشار کے عین اُوپر ایک بوڑھا آدمی نظر آیا جو ایک کُٹیا کے سامنے بیٹھا ہوا اپنی گُدڑی میں پیوند لگا رہا تھا۔ اس کی کُٹیا، ان کے اندر ایک چھوٹی کھو میں تھی جس کے سامنے دو ڈھائی گز چوڑا ہموار قطع تھا۔ وہیں دھوپ میں بیٹھا ہوا وہ اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس کی سفید داڑھی سینے تک بڑھ آئی تھی۔ بالوں کی سفید لٹیں کانوں تک پہنچی ہوئی تھیں۔ بھنویں بھی سفید اور اتنی گھنی تھیں کہ آنکھیں ان میں چھُپ گئی تھیں۔ باتوں کی آواز پر اُس نے چونک کر سر اُٹھایا اور حیران ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ان کے لباس سے سمجھ گیا تھا کہ یہ لوگ اس طرف کے رہنے والے نہیں۔ اس نے اِشاروں ہی سے پوچھا کہ وہ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟

اور کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟

عُرفی اور عظمی نے بھی اِشاروں ہی میں سمجھایا کہ بُہت دُور سے سیر و شکار کے لیے آئے ہیں اور آگے جارہے ہیں۔ آگے جانے کا اشارہ انہوں نے چٹانوں کے اس پار کی طرف کیا۔ جسے دیکھ کہ بوڑھامارے حیرت کے بالکل کنارے کے اُوپر آکر کھڑا ہو گیا اور اب تو وہ اشاروں کے ساتھ ساتھ بُلند آواز میں کُچھ کہہ بھی رہا تھا جو ان کی سمجھ میں نہ آیا کیونکہ اوّل تو وہ اس کی زبان نہیں سمجھتے تھے، دوسرے پانی گرنے کے شور سے کان پڑی آواز سنائی ہی نہیں دیتی تھی۔ وہ اس کے اشاروں سے صرف اِتنا سمجھے کہ ان پہاڑیوں کے پار جانا خطرناک ہے۔ وہ اپنے چہرے پر خطرے اور خوف کے آثار ظاہر کر رہا تھا۔ مگر وہ دونوں اُس کی حرکتوں پر ہنسنے لگے جس سے بوڑھا شاید خفا ہو گیا۔ اور جلدی سے واپس پلٹ کر اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔

"واہ عرفی، تُم نے ہنس کر خواہ مخواہ بڑے میاں کو خفا کر دیا۔ وہ ہمیں بتا رہا تھا کہ اِس طرف نہ جاؤ، خطرہ ہے۔ ہم اس سے پُوچھ تو لیتے کہ کِس قسم کا خطرہ ہے۔"

عظمی نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

"لو اب میر نام لگانے لگے۔ تم خود بھی تو ہنسے تھے۔" عرفی کہنے لگا۔

"تمہیں نے مُجھے ہنسادیا۔ وہ خبر نہیں کیا بتانا چاہتا تھا۔" عظمی کہہ رہا تھا۔

"ارے بھائی، اس طرف ڈاکوؤں ہی کا خطرہ ہوتا ہے، کوئی جِنّوں پریوں کا ٹھکانا تو نہیں ہو گا جس سے ہم ڈر جائیں۔ ہم پانچ آدمی ہیں اور پانچوں مسلّح۔ پھر ہمارے ساتھ خِضر خاں جیسا بہادر آدمی ہے جس سے یہاں کے لوگ ڈرتے ہیں۔ ہمیں کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔ بُوڑھے نے سمجھا ہو گا میں ہم دونوں ہی ہیں۔" عُرفی نے اپنے دوست کو تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد وہ واپسی پلٹے۔ عظمی کچھ دیر چپ چاپ سر جھکائے کچھ سوچتا رہا۔

"پھر بھی ہمیں اپنے ساتھیوں سے اس کا ذکر کرنا چاہیے۔ خِضر خاں اور عاقل یہاں کی زبان جانتے ہیں۔ وہ آکر اس سے پوچھیں گے کہ کیسا خطرہ ہے۔" عظمی نے کچھ سوچنے کے بعد تجویز پیش کی۔

”واہ، تم بھی جو بات کرو گے اب احمقوں کی سی کرو گے۔ ابھی وہ لوگ پھر واپسی پر اڑ جائیں گے۔“ عُرفی بولا۔

”خطرے کی صورت میں واپسی تو لازمی ہے۔ تُم چاہتے ہو کہ موت کے منہ میں ضرور جائیں؟“ عظمی کہنے لگا۔

”واہ رے میرے بہادر سیّاح۔ موت کے منہ میں جانے کا ذکر تو تم نے ایسے کیا گویا آگے گولہ باری ہو رہی ہے۔ ارے بھیّا، سیر و شکار میں خطرے تو پیش آتے ہی ہیں۔ وہ سیاحت ہی کیا جس میں بہادری کے کارنامے اور جان جوکھوں کی باتیں شامل نہ ہوں۔“ عُرفی نے جوش سے کہا۔

”یعنی تم بھی اپنے سفر نامے کو ابنِ بطوطہ اور مارکو پولو کی طرح تاریخی بنانا چاہتے ہو؟“ عظمی نے ہنس کر پُوچھا۔

”کیوں نہیں۔۔۔“ عُرفی نے تن کر کہا۔ اب وہ اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ گئے جو روانگی کے لیے تیّار کھڑے تھے۔

”خبر دار جو تم نے اس بُڈّھے کا ذکر کیا۔ اگر عاقل بھیّا نے سفر ملتوی کر دیا تو میں تُم سے عُمر بھر نہیں بولوں گا۔“ عُرفی نے اپنے دوست کو تاکید کر دی۔

”تم بہُت دُور نکل گئے میرے دوستو، ہم تمہارے پیچھے آنے ہی والے تھے۔“ خِضر خان نے انہیں آتے دیکھ کر کہا۔

”جی ہم اس جھرنے کے منبع تک ہو کر آئے ہیں۔“ عُرفی نے کہا۔

”کیونکہ عُرفی کا خیال ہے کہ اپنی سیاحت کو اہم بنانے کے لیے ہمیں کچھ بہادرانہ کارنامے انجام دینے اور چند مُہمیں سر کرنی چاہیں۔“ عظمی نے ہنس کر کہا۔

”تو چلو، مُہمّات کی تلاش میں آگے بڑھیں۔“ خِضر خان نے ہنس کر کہا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ باقی لوگوں نے بھی اپنی اپنی سواریوں پر چڑھ کر خضر خان کے پیچھے پیچھے لگام اُٹھائی۔

”شام ہوتے ہوتے ہمیں دو منزلیں طے کر لینی چاہیں۔“

خِضر خاں کہنے لگا اور سب نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی۔ عُرفی اور عظمی کے گھُٹے ہوئے

جسم والے پہاڑی یابُو بھی ان کے برابر ہی دوڑ رہے تھے۔ اِن دونوں کو اس سے پہلے سواری کا بہت کم موقع ملا تھا مگر سفر کے دوران انہیں خاصی مہارت ہو گئی اور اب تو وہ خاصے شاہ سواروں کی طرح جم کر بیٹھے تھے اور یابُو کتنا کی تیز کیوں نہ دوڑے ذرا نہیں گھبراتے تھے۔

چٹانوں کے سلسلے کو عبور کرتے ہی وہ ایک لق و دق صحرا میں پہنچے۔ جہاں تک نظر کام کرتی سبزے کا نام و نشان دکھائی نہ دیتا۔ کہیں کہیں ببول کی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ اُن میں بھی پتّے کم اور کانٹے زیادہ تھے۔ البتّہ زقوم یعنی تھوہر کی کثرت تھی۔ جلی ہوئی چٹالوں کے دامن میں لمبے لمبے خار دار پتّوں والی تھوہر کی گھنی جھاڑیاں میلوں تک چلی گئی تھیں۔ ان کے علاوہ اس وسیع ریگستان میں ہریالی کی قسم کی کوئی چیز نہ تھی۔

خِضر خاں نے ریگستان کی سمت سے کترا کر چٹانوں کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کیا۔ اس جگہ زمین نسبتاً سخت تھی اور گھوڑوں کے پاؤں ریت میں نہیں دھنستے تھے۔ شام ہوتے ہوتے وہ کئی میل کی مسافت طے کر آئے لیکن خِضر خان کے

بیان کے مطابق ابھی ایک تہائی سفر باقی تھا۔ شام ہوتے ہی مشرقی اُفق سے چاند کی بڑی سی سنہری ٹکیہ نمودار ہوئی اور ریگستان میں دودھیا چاندنی بچھ گئی۔

خِضر خان کے اشارے پر سب نے رفتار اور بھی تیز کر دی۔ اِتنے لمبے سفر سے دونوں لڑکوں کو بھوک لگنے لگی تھی لیکن خِضر خان ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا کیوں کہ اس علاقے میں ڈاکوؤں کا خطرہ تھا۔ سب چُپ چاپ بڑھتے جا رہے تھے۔

آ گئے چل کر چٹانیں بھی ختم ہو گئیں اور دُور دُور تک کھُلا میدان نظر آنے لگا۔ اچانک دُور سے انہیں کچھ سوار اپنی طرف آتے دکھائی دیے۔

"ہمیں ہوشیار ہو جانا چاہیے۔ خطرہ ہے۔" خِضر خان نے پُکار کر کہا۔

"ہو سکتا ہے مسافر ہوں۔" قاسم نے خیال ظاہر کہا۔

"نہیں، مسافر اس طرف بہت کم آتے ہیں۔ اگر ایسی بات ہوتی تو مسافروں کا آنا میرے علم میں ہوتا۔" خِضر خان نے جواب دیا۔

”تو پھر ہمیں یہیں ٹھہر کہ ان کا انتظار کرنا چاہیے۔“ عاقل نے تجویز پیش کی اور ببول کی گھنی جھاڑیوں کے قریب سب نے اپنے گھوڑے روک لے کیونکہ یہ جگہ کمین گاہ کے لیے بہتر تھی۔ وہ سب ان جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو گئے اور جس وقت وہ سوار قریب پہنچے تو خِضر خان نے اِطمینان سے کہا:

”صرف چار آدمی ہیں۔ ہم ان سے بخوبی نپٹ سکتے ہیں۔“

اب وہ سوار اور قریب آ گئے تھے۔ خِضر خان نے للکار کر پُوچھا۔ ”تُم کون لوگ ہو اور کہاں جاتے ہو؟“

”یہی سوال ہم تم لوگوں سے پوچھنا چاہتے تھے۔ تم کون ہو؟“ ان میں سے ایک نے پوچھا۔

”ہم مُسافر ہیں۔ اگر تم بھی مُسافر ہو تو اپنی راہ لو۔ ہم تمہیں کچھ نہ کہیں گے۔“ خِضر خاں کہنے لگا۔

”ورنہ۔۔۔“ اس نے پوچھا اور اس کے ساتھی قہقہے لگا کر ہنسنے لگے۔

"ورنہ مُقابلہ پر آؤ اور نپٹ لو۔" خِضر خان نے گرج کر کہا۔

"بس ٹھیک ہے۔" اس آدمی نے جواب دیا۔

خِضر خاں نے اپنے ساتھیوں سے آہستہ آہستہ کُچھ کہا اور عاقل اور قاسم کو ساتھ لے کر جھاڑیوں کے پیچھے سے کھلے میدان میں نکل آیا۔ دونوں لڑکے اس کی ہدایت کے مطابق جھاڑیوں کی اوٹ میں چھُپے رہے۔

"لو تیّار ہو جاؤ۔" قاسم نے للکار کر کہا اور ساتھ ہی تینوں نے اپنی رائفلوں کی نالیاں اُن کی طرف پھیر دیں۔ ان میں سے دو کے پاس بندوقیں تھیں۔ انہوں نے بھی نشانہ لیا اور آمنے سامنے فائر ہونے لگے۔ یہ لوگ پیچھے ہٹتے ہٹتے فائر کر رہے تھے۔ وہ آگے بڑھے آ رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب وُہ جھاڑیوں کے قریب سے گُزر آئے تو عرفی اور عظمی ان پر پیچھے کی طرف سے فائر کرنے لگے۔ وہ بوکھلا کر پیچھے مُڑے تو خِضر خاں اور اس کے ساتھیوں نے تابڑ توڑ گولیاں برسانی شروع کیں۔ چاروں سوار ریت پر تڑپ کر ٹھنڈے ہو گئے اور ان کے گھوڑے بے لگام ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ خِضر خان نے گھوڑے سے اُتر کے

پہلے تو لاشوں کا معائنہ کیا۔ تین آدمی مر چکے تھے۔ ایک زخمی تھا۔ زخم بھی اس کے بازو میں آیا تھا اور وہ غالباً جان بُوجھ کر مُردہ بنا ہوا تھا۔ ورنہ اس کا زخم اتنا معمولی تھا کہ ایک ہٹّے کٹّے جوان آدمی کا اتنے سے زخم سے بے ہوش ہو جانا ممکن نہ تھا۔ خِضر خان نے سب کی تلاشی لی اور اُن کی ہر چیز اپنے قبضے میں لے لی۔ عاقل اور قاسم کو اس کی یہ حرکت پسند نہ آئی۔ مگر وہ چُپ رہے۔

"یہ ہمارا مالِ غنیمت ہے۔" خِضر خاں نے چیزوں کو اپنے گھوڑے پر لادتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں۔ یہ صرف آپ ہی کا حصّہ ہے۔ ہمیں اس میں سے کوئی چیز نہیں چاہیے۔" عاقل نے خِضر خان ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔ "اب آپ ان بدمعاشوں کے غم میں کُڑھ رہے ہیں؟"

"کُڑھنے کی تو بات ہی ہے۔ ہم شکار کو نکلے تھے مگر شکار کے بجائے انسانوں کا خون کر رہے ہیں۔" عاقل کہنے لگا۔

"ہمیں اپنی جان بچانے کے لیے ایسا کرنا پڑا۔ اگر ہم انہیں نہ مارتے تو یہ ہمیں مار

ڈالتے۔ ان کا پیشہ ہی یہ ہے۔" خِضر خاں نے کہا۔

اس نے زخمی آدمی کو اپنے گھوڑے پر ڈالا اور خود بھی سوار ہو گیا۔ ان لوگوں کے قبضے سے اُسے خاصی بڑی رقم ہاتھ آئی تھی اور وہ بہت خوش تھا۔

"اِس ڈاکو کو کہاں لے جائیں گے خاں صاحب؟" قاسِم نے پوچھا۔

"اِس کا علاج کروں گا۔ یہ اپنے ساتھیوں کا سُراغ بتائے گا۔ میرا دوست جابِر خاں، جس کے ہاں آپ کو لے کر جا رہا ہوں، اپنے آدمیوں کے ہمراہ ان کی کمین گاہوں پر چھاپا مار کر انہیں گرفتار کر لے گا۔۔۔ یہ لوگ اُسے بہت تنگ کرتے ہیں، اس کے تجارتی قافلوں پر حملے کر کے لوٹ لیتے ہیں۔ اس کے مہمانوں کو بھی تنگ کرتے ہیں۔" خِضر خاں کہنے لگا۔

"ابھی ہماری منزل کتنی دور ہے؟" قاسم نے پُوچھا۔

"کیوں؟ آپ کو ڈر ہے کہ کہیں ان کے اور ساتھی ہمیں نہ گھیر لیں۔" خِضر خان نے ہنس کر کہا۔

”نہیں۔ ایسا خیال تو نہیں۔ مجھے تو صِرف بھُوک تنگ کر رہی ہے اس وقت۔“ قاسِم نے جواب دیا۔

”بس اب زیادہ دُور نہیں۔ پون گھنٹے میں ہم جباریہ کی حد میں داخل ہو جائیں گے۔“خِضر خان نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔

”یہ جباریہ کیا جگہ ہے؟“ عاقِل نے پوچھا۔

”جابِر خان کی چھوٹی سی ریاست کا نام ہے۔“خِضر خان کہنے لگا۔

ریت کی وجہ سے ان کے گھوڑے بہت تیز نہیں دوڑ سکتے تھے۔ پھر بھی انہوں نے اپنے اپنے جانوروں کو ایڑ لگاتے ہوئے جہاں تک ممکن تھا تیز دوڑانا شروع کیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد انہیں دُور سے روشنی نظر آنے لگی۔

”بس ہم منزل پر آ پہنچے۔ وہ جو سامنے روشنی نظر آ رہی ہے وہی ہے جباریہ۔“ خِضر خان نے اپنے ساتھیوں کو بتایا۔

عُرفی اور عظمیٰ بہت تھک گئے تھے۔ عُرفی نے جمائی لے کر کہا۔ ”میں تو گھوڑے

پر سے گرا ہی چاہتا ہوں۔ ہاتھ پیروں میں جان ہی نہیں رہی۔"

"اُوہو، میں سمجھا۔ تُم نے چائے جیسی بے ہودہ چیز کی عادت ڈال رکھی ہے۔ آج سہ پہر کو تم نے چائے نہ پی تو دیکھ لو کیا حال ہو گیا۔" عظمی نے کہا۔

"ہاں ہاں یہی بات ہے۔" عارف کہنے لگا۔

"عادت کیا معنی، یہ تو باقاعدہ نشہ ہو گیا کہ ایک چیز نہ ملنے سے انسان بے کار ہو کر رہ جائے۔ اگر سیر و سیاحت کے شوقین ہو تو اپنے آپ کو کسی ایسی چیز کا عادی نہ بناؤ جو نہ مل سکے تو ہوش و حواس جاتے رہیں اور ہاتھ پاؤں پر قابو نہ رہے۔" قاسِم نے کہا۔

"بھائی جان۔ دیکھ لیجیے میں کسی چیز کا عادی نہیں۔ چائے مِل جائے تو خیر نہ ملے تو پروا نہیں۔" اعظم نے کہا۔

"بچوں کے لیے تو چائے بہت نقصان دہ ہے۔ اس میں کئی ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو خون میں حدّت اور اعصاب میں تحریک پیدا کر کے انہیں کمزور کر دیتی ہیں اور

جسمانی نشوونما کو روک دیتی ہیں۔" عاقل نے کہا۔

عارف کی طبیعت خراب ہو جانے کی وجہ سے اب وہ لوگ آہستہ چلنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس کی حفاظت کے خیال سے قاسم اور عاقل اس کے دونوں طرف چل رہے تھے۔

"اب کچھ زیادہ دور نہیں۔ آپ میرے پیچھے پیچھے چلے آئیں۔ میں آگے چل کر پھاٹک کھلواتا ہوں۔ اس آدمی کا خُون بہت نِکل چکا ہے۔ نبض ڈوبتی جارہی ہے۔ امید نہیں کہ بچ سکے۔ پھر بھی کوشش کرنی چاہیے۔ میں اس کے زخم کو معمولی سمجھا تھا۔"

اتنا کہہ کر خِضر خاں نے گھوڑے کر ایڑ لگائی اور آگے بڑھ گیا۔ کوئی آدھا گھنٹا اور چلنے کے بعد یہ لوگ بھی اس چار دیواری کے پھاٹک پر پہنچ گئے جہاں روشنی نظر آ رہی تھی۔ زخمی ڈاکو کو خادم اُٹھا کر اندر لے گئے تھے۔ خِضر خان اپنے ساتھیوں کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا جو یقیناً جابِر خان تھا۔ ادھیڑ عمر کا یہ لمبا چوڑا آدمی لمبی سی فرغل پہنے ہوئے تھا۔ گلہری کی دُم جیسی گچھے

دار مونچھیں، پھُولے ہوئے کلّوں پر چھائی ہوئی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں میں بلا کی تیزی اور چمک تھی۔ مہمانوں کے پہنچتے ہی کئی خادم ان کی طرف لپکے اور گھوڑوں کی لگامیں تھام لیں۔ صاحبِ خانہ استقبال کے لیے باہر نکل آیا۔ خِضر خان نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"یہ میرے دوست ہیں۔ سیر و شکار کے بے حد شوقین ہے۔ اسی غرض سے میں انہیں تمہارے پاس لایا ہوں۔"

"ہم ان کے شوق کو پورا کرنے کی ہر مُمکن کوشش کریں گے۔"

جابِر خان نے کہا اور ان سے باری باری ہاتھ ملایا۔ وہ سب پھاٹک کے اندر داخل ہوئے اور کوئی چار پانچ گز چوڑا چبُوترا طے کرنے کے بعد دس بارہ سیڑھیاں اُتر کر نیچے آئے۔ یہ باغ اور محل بیرونی سطح سے کافی نشیب میں تھا۔ اس طرح اس کے باہر کی چار دیواری اندر کی طرف سے دوگنی اُونچی ہو گئی تھی۔ بنجر اور ویران صحرا کے سفر کے بعد یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بہشت میں آپہنچے ہوں۔ چھٹکی ہوئی سفید چاندنی میں باغ کے سر سبز قطعے بڑے دل کش نظر آرہے تھے۔ پھولوں کی

مہک فضا میں رچی ہوئی تھی۔ مگر سردی کافی بڑھ گئی تھی۔ وہ اپنے میزبان کے پیچھے پیچھے محل میں داخل ہوئے اور چمن پر اچٹتی ہوئی نگاہ ہی ڈال سکے۔

سیڑھیاں چڑھ کہ وہ محل کے صدر دروازے میں داخل ہوئے۔ ایک بہت وسیع ہال کی چھت میں بلّور کے فانوس لٹک رہے تھے جن میں کافوری شمعیں روشن تھیں۔ کونے میں رکھے ہوئے عُود دانوں سے ہلکا ہلکا خُوشبودار دھواں اُٹھ رہا تھا۔ آتش دان میں الاؤ جل رہا تھا۔ کچھ فاصلہ چھوڑ کر تینوں طرف ہاتھ بھر اُونچے تختوں پر ایک بڑی سی مسند تھی جو قیمتی قالینوں اور زربفت کے تکیوں سے سجی تھی۔ اس سنسان ویرانے میں ایسے شاہانہ محل کی موجودگی، الف لیلےٰ کے کسی قصّے کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ مہمان بھی دل چسپی سے ہر چیز کو دیکھ رہے تھے۔ ہال کمرے کی دیواروں پر بارہ سنگوں کے بے شمار سر لٹکے ہوئے تھے۔ طاقوں میں جابجا عجیب و غریب پرندوں اور چھوٹے چھوٹے جانوروں کے حنوط شدہ مجسمے رکھے تھے۔ فرش پر قالینوں کے علاوہ شیر چیتے اور ہرن کی کھالیں رکھی تھیں۔ جابجا جنگی ہتھیار آراستہ تھے۔ کونوں میں لمبے لمبے نیزے اور بھالے کھڑے

تھے۔ جابِر خان نے اپنے مہمانوں کو بڑے تپاک سے مسند پر بٹھایا۔

"خاں، اب جلدی سے کھانے کے لیے کُچھ منگوائیے۔ میرے دوستوں کو بھُوک لگی ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں جن لوگوں کو سفر کی عادت نہ ہو اُن کے لیے یہ فاصلہ ہی کافی سے زیادہ ہے۔ اور پھر ہمیں راہ میں ایک زبردست معرکہ بھی پیش آیا جس کی وجہ سے سفر کُچھ ناگوار سا ہو گیا۔" خِضر خان نے کہا۔

جابِر خان کا اشارہ پا کر خادم کھانے کا انتظام کرنے چلے گئے اور یہ لوگ آپس میں ہنسنے بولنے لگے۔

"راستے میں کسی نے کہا تھا کہ بھُوک لگی ہے مگر میں نے ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔" خِضر خان نے کہا۔

"ماشاء اللہ، سب ہی تنومند جوان ہیں۔ بھُوک تو واقعی انہیں خوب لگنی چاہیے۔" جابِر خان نے ان سب کی طرف غور سے دیکھ کر کہا۔

"سرزمینِ پنجاب کے شیر ہیں یہ، میرے ننھے دوست۔ دیکھو، ابھی پندرہ سال کی

عُمر نہیں مگر مُجھ سے باشت بھر اُونچا قد ہے۔" خِضر خاں کہنے لگا۔

"ماشاء اللہ۔" جابِر خاں کھُبتی ہوئی نظروں سے دونوں لڑکوں کو دیکھ کر بولا۔ پھر اس کے پوچھنے پر خِضر خان نے راستے میں ڈاکوؤں کے ساتھ لڑائی کا سارا حال سُنایا۔

"اچھا تو انہیں میں سے ایک کو تُم اپنے ساتھ اُٹھا لائے، یہ بہت اچھا کیا تم نے۔ اگر یہ شخص بچ گیا تو میں اِن کے سارے گروہ کا سراغ لگا کر انہیں گرفتار کرلوں گا۔ اِن بدبختوں نے میرے آدمیوں کو تنگ کر رکھا ہے۔"

"کہاں ہے وہ؟" قاسم نے پوچھا۔

"اسے مطب میں حکیم کے پاس لے گئے ہیں۔"

"مطب میں؟ یہاں مطب بھی ہے؟" قاسم نے حیران ہو کر سوال کیا۔

"جی ہاں۔ یہاں ویرانے میں رہتے ہوئے یہ تو بے حد ضروری ہے کہ علاج کا کوئی ذریعہ میسّر ہو۔ میرے ہاں درجنوں مہمان موجود رہتے ہیں اور دُکھ سُکھ ہر وقت

انسان کے ساتھ ہے۔"

جابِر خان نے سنجید گی سے جواب دیا۔ اِتنے میں تین چار خادم بڑے بڑے خوان اُٹھائے ہوئے داخل ہوئے۔ مسند سے ذرا ہٹ کر قالین کے فرش پر بہت لمبا چوڑا دستر خوان بچھایا گیا اور جابِر خاں نے نہایت تپاک سے اپنے مہمانوں سے کھانا کھانے کی درخواست کی۔

پراسرار میزبان

جابِر خان کی یہ وسیع رہائش گاہ کئی مربع زمین گھیرے ہوئے تھی۔ محل کے علاوہ بھی اردگرد کئی عمارتیں تھیں۔ بہت وسیع لان تھے جن میں پھُولوں کے بے شمار پودوں کے علاوہ جا بجا پختہ چبوتروں والے کُنج بنے ہوئے تھے جو پھولوں والی بیلوں سے چھت تک ڈھکے ہوئے تھے۔ سبز گھاس کے قطعوں اور پھولوں سے ڈھکی ہُوئی کیاریوں کے درمیان بیشتر روشیں تھیں۔ محل کے پچھواڑے اُونچے اُونچے درختوں کا اچھّا خاصا جنگل تھا۔ دائیں طرف ایک بہت وسیع باغ تھا جس میں ہر قسم کے پھل ہوتے تھے۔ باغ کے درمیان سے ایک چھوٹی سی نہر گزرتی

تھی جو اُن پہاڑوں کے کسی چشمے سے کاٹ کر لائی گئی تھی جن کے دامن میں یہ سر سبز قطعہ واقع تھا۔ چمنستانوں میں جا بجا خوب صورت حوض تھے جن میں فوّارے چل رہے تھے۔

عارف اور اعظم کو ایک ہی کمرے میں ٹھہرایا گیا تھا۔ اعظم ابھی سو رہا تھا کہ عارف نے مشرقی سمت کے دریچے کھول دیے۔ سردی سے ٹھٹھری ہوئی سورج کی پیلی پیلی کرنیں، دُھند کو چیرتی ہوئی دیوار کی راہ کمرے میں داخل ہُوئیں۔ عارف باغ کا نظّارہ کرنے لگا۔ اتنے میں ایک حبشی خادم حاضر ہُوا اور اشارہ سے بتایا کہ مالِک ناشتے پر انتظار کر رہے ہیں۔ یہ حبشی لڑکا گونگا تھا۔ لیکن عموماً گونگوں کی طرح بہرا نہیں تھا۔ بخوبی سن سکتا تھا۔ اس کا اشارہ سمجھ کر عارف نے اعظم کو جگایا۔

"بھئی کچھ دیر سو لینے دیا ہوتا۔" وہ کروٹ بدل کر لحاف کو لپیٹتے ہوئے بولا۔

"چلو آٹھ بیٹھو عظمی، بُری بات ہے۔ سب ناشتے پر ہمارے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ دیکھو لڑکا بُلانے آیا ہے؟" عارف نے ذرا خفگی سے کہا۔

”اچھا بھئی چلو۔“ اعظم نے لحاف پھینک کر اُٹھتے ہوئے کہا۔ اس کا خیال تھا کہ حبشی لڑکا ان کی بات نہیں سمجھ سکتا مگر وہ اس کی بات پر زور سے ہنسا اور اشارہ کیا کہ جلدی چلو۔ اس پر انہیں معلوم ہوا کہ وہ سُن سکتا ہے۔

”ہم لوگ منہ ہاتھ کہاں دھوئیں؟“ عارف نے لڑکے سے پوچھا۔

لڑکا انہیں اپنے ساتھ حمّام میں لے گیا اور سمجھایا کہ یہ حمّام ان کے اور ان کے ساتھیوں کے لیے ہے اور کوئی اس جگہ نہیں آ سکتا۔

”اور ہمارے بھائی کہاں ہیں؟“ اعظم نے پوچھا تو لڑکے نے اشاروں سے بتایا کہ وہ بھی دستر خوان پر اُن کے منتظر بیٹھے ہیں۔ یہ سن کر اُن دونوں نے جلدی جلدی مُنہ ہاتھ دھویا اور تیّار ہو کر خادم کے ساتھ چلے۔ وہ اُنہیں لے کر لمبی راہداریوں میں سے گزرتا ہوا ایک کمرے کے سامنے رُک گیا اور انہیں اندر جانے کا اِشارہ کیا۔ یہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ ایک نہایت خوب صُورت کمرہ تھا جس کے اُونچے اُونچے دروازوں پر سبز اطلس کے بھاری پردے پڑے تھے اور فرش پر گہرے نیلے رنگ کا ایرانی قالین بچھا تھا۔ ان کے تینوں

ساتھی، میزبان کے ساتھ دستر خوان کے گرد بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ یہ دونوں بھی اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ دستر خوان پر ناشتے کے لیے تازہ اور خشک میوے کے طشت سجے ہوئے تھے۔ شہد میں پکایا ہوا پھلوں کا مربّہ تھا۔ خاگینہ اور شیر مال تھے۔ کئی قسم کا حلوا اور مال پُورے موجود تھے۔ سب سے پہلے ایک خادم نے چاندی کے نقشین کٹوروں میں دودھیا شربت پیش کیا۔ یہ بادام اور الائیچی کو دودھ میں پیس کر بنایا گیا تھا اور نہایت خوش ذائقہ تھا۔ اسے پیتے ہی دل اور دماغ کو عجیب قسم کی تازگی پہنچی۔ اعظم جو ابھی تک نیند کے خُمار کو دُور نہ کر سکا تھا اسے پی کر ایک دم اپنے آپ کو ترو تازہ محسوس کرنے لگا۔ خِضر خاں نے تو تکلّف کو ایک طرف رکھتے ہوئے غٹا غٹ دو کٹورے پیے۔ ناشتے کے دوران ہی جابِر خان نے شکار کا پروگرام بنایا۔ وہ شخص دیکھنے میں جتنا ہیبت ناک تھا، باتوں میں اتنا ہی دِل چسپ تھا۔ عارف اور اعظم اس کے دل چپ پروگرام کو سُن کر جلد ہی اس کے ساتھ مانوس ہو گئے اور باتوں میں دخل دینے لگے۔

”تو پھر ہم کل صُبح روانہ ہوں گے؟“ عارف پوچھنے لگا۔

”ہاں میرے ننّھے دوست، کل صُبح ہی صُبح۔ آج کا دن ہمیں تیّاری میں لگے گا۔ میں ابھی آپ کے سامنے اپنے آدمیوں کو بُلوا کر ضروری احکام دُوں گا۔“

اور اس نے دستر خوان بڑھائے جانے کے ساتھ ہی خادِم کو حکم دیا کہ میرِ شکار کو اس کے عملے سمیت حاضِر ہونے کا پیغام ہے۔ اُس کے بعد وُہ عاقل اور قاسم سے اُن کے سفر کا حال پوچھتا رہا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد چار حبشی کمرے میں داخل ہوئے اور جھُک کر آداب بجالاتے ہوئے سینے پر ہاتھ باندھ کر خاموش کھڑے ہو گئے۔

”ماہر۔۔۔“ بہادر خان نے اُن میں سے ایک کو مخاطب کیا تو ایک لمبا تڑنگا اور ڈاؤنی صُورت والا حبشی قطار میں سے دو قدم آگے نکل آیا۔ اس شخص کی شکل و صورت جلّادوں جیسی تھی۔

”دیکھو ماہر، میرے یہ دوست کستُوروں کے شکار کا شوق رکھتے ہیں۔ ہمیں کل ایک پہر رات رہے روانہ ہو جانا ہے۔ تم سارے انتظام مکمل کر لو۔ جو کتّے ساتھ لے جانے میں اُنہیں اسی وقت سے راتب دینا بند کر دو۔“

ماہر نے سر جھُکا کر تعمیل کا وعدہ کیا مگر مُنہ سے ایک لفظ نہ کہا۔ گمان تھا کہ شاید وہ

بھی گونگا ہے لیکن بعد میں ثابت ہوا کہ ایسا نہیں۔ اس کے بعد جابِر خاں نے اس خادِم کے ذریعے، جو ناشتے پر حاضر تھا باورچی سے کہلوایا کہ کھانا تیّار کر کے توشے دانوں میں بھر وادے۔ اس کے بعد وہ اطمینان سے تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا اور پیچوان کی نَے ہونٹوں میں دبا کر جلدی جلدی کش لینے لگا۔ ان سب کو حیرت ہوئی کہ اس کے کش پینے سے دھوئیں کے دودھیا مرغولے اُٹھتے تو اس میں سے تمباکو کی جانی پہچانی بُو کے بجائے نہایت لطیف خوشبو کمرے میں پھیل جاتی۔

"آپ کے یہاں خوشبودار تمباکو ہوتا ہے خان صاحب؟" آخر اعظم سے نہ رہا گیا تو اس نے جابِر خاں سے پوچھ لیا۔

"ہاں بھئی۔ یہ تمباکو جو میں استعمال کرتا ہوں اصفہانی خمیرہ کہلاتا ہے۔ اس میں تمباکو برائے نام ہوتا ہے اور یہ خوشبودار جڑی بوٹیاں ڈال کر بنایا جاتا ہے۔" جابِر خان کہنے لگا۔

"دیکھ لیں۔ ہمارا دوست جابِر خاں کسی بادشاہ سے بڑھ کر شاہ خرچ اور شوقین آدمی ہے۔ دنیا سے الگ تھلگ رہتے ہوئے بھی دنیا کی کون سی نعمت ہے جو اسے

میسّر نہیں۔"خِضر خاں کہنے لگا۔

"جابِر خاں نے سوائے ایک خوفناک قہقہے کے کوئی جواب نہ دیا۔ اب پہر دِن چڑھ آیا تھا۔ دھوپ کافی تیز ہو گئی تھی۔ عارف اور اعظم نے چمن میں جا کر ٹہلنے کا شوق ظاہر کیا۔

"میں آپ سے خود ہی کہنے والا تھا۔ آیئے آپ کو چمن کی سیر کراؤں۔" جابِر خاں کہنے لگا۔

"آپ تکلیف نہ کریں۔ بچّے ہیں۔ خود ہی کھیل کُود آئیں گے۔" عاقل کہنے لگا۔

"آپ بھی تو دھوپ میں نکلئے نا۔" جابِر خان نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ خِضر خاں اور باقی سب لوگ بھی اُٹھے۔ باہر آئے تو چمکیلی دھوپ سر سبز قطعوں، ہرے بھرے درختوں اور پھولوں سے لدے ہوئے پھُولوں پر سُنہری کِرنوں کی بارش برسا رہی تھی۔ ہر چیز پر ایک نیا نکھار تھا۔ مگر اس وقت ان سب کی توجّہ کو اپنی طرف کھینچنے والے عجیب و غریب مناظر اور ہی تھے۔ یہ لوگ صدر دروازے کے سامنے اُونچے چبوترے پر کھڑے تھے اور سامنے وسیع لائن میں

کئی آدمی ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر چھوٹے چھوٹے قالینوں لگائے بیٹھے ہوئے تھے اور صرف جانگیہ پہنے ہوئے تھے۔ حبشی خادم ان کے جسم پر مالش کر رہے تھے۔ان کے جسم خوب گٹھے ہوئے اور ورزشی تھے اور جلد مخمل کی طرح چمک دار نظر آتی تھی۔

"یہ کون لوگ ہیں؟" قاسم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ سب جابِر خاں کے مہمان ہیں۔ دیکھی آپ نے ہمارے دوست کی مہمان نوازی؟" خِضر خاں ہنس کر کہنے لگا۔

"خوب۔" قاسم نے حیران ہو کر کہا۔ مگر عاقل کسی گہری سوچ میں تھا۔ وہ کُچھ نہ بولا۔

دونوں لڑکے ان صحت مند جوانوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

"کوئی مہمان مہینوں قیام کرے تب بھی اس کی خاطر میں فرق نہیں آتا۔ ہر مہمان کی خدمت کے لیے ایک خادم مقرّر کر دیا جاتا ہے۔" خِضر خان نے بتایا۔

"تو یہ مہمان مہینوں یہیں بیٹھے رہتے ہیں؟" عاقل نے پوچھا۔

"یہ سب لوگ میرے پرانے دوست ہیں۔ دُور درازوں مُلکوں سے آئے ہیں۔ میں بھی اس ویرانے میں انہی لوگوں کے سہارے زندگی گزار رہا ہوں۔ جانا چاہتے ہیں تو اصرار کر کے پھر ٹھہرا لیتا ہوں۔ ان کے ساتھ میرا اچھّا وقت کٹ جاتا ہے۔" جابِر خاں کہنے لگا۔

"پانچ دس چلے گئے تو پانچ دس اور آ گئے۔ خُوب رونق رہتی ہے۔ جنگل میں منگل بنا رکھا ہے ہمارے دوست نے۔" خِضر خان بولا۔

جابِر خاں سب سے آگے آگے سیڑھیاں اُترنے لگا۔ اور پھر اس قطعے سے ہٹ کر ایک روش پر ہوتا ہُوا انہیں دوسری طرف کے ایسے ہی قطعے کی طرف لے چلا۔

"یہ لوگ ننگے بدن ہیں اس لیے نئے آدمیوں سے گھبرائیں گے۔ کسی دن کھانے پر انہیں آپ سے ملواؤں گا۔" جابِر خاں کہنے لگا۔

وہ سب کو ساتھ لیے ہوئے اس قطعے کے آخری سرے تک نکل گیا اور پھل دار

درختوں کے باغ تک پہنچ کر پھر واپس پلٹا۔ قطعے کے بیچ میں ایک خادِم نے قالین بچھا کر چند تکیے لگا دیئے تھے۔ دوسرا آدمی جابِر خان کا پیچوان اُٹھائے چلا آرہا تھا۔ سب دھوپ میں بیٹھ گئے اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ جابِر خان اپنی سیر وسیاحت کے عجیب وغریب واقعات سناتا اور خوشبودار تمباکو کا دھواں فضا میں پھیلاتا رہا۔ پھر خِضر خاں کی فرمائش پر اس نے شکار کے کارنامے بیان کرنے شروع کیے جن میں خِضر خاں بھی اس کے ساتھ شریک ہو گیا۔

"وہ شیر بھی آپ ہی نے مارے تھے جن کی کھالیں ہال میں بچھی ہوئی ہیں؟" عارف نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں میرے دوست۔ وہ شیر میں نے قفقاز میں مارا تھا۔" جابِر خان نے جواب دیا اور مہمانوں کی فرمائش پر اس کا حال بیان کرنا شروع کر دیا۔ وہ لگاتار آدھ گھنٹے تک بولتا رہا اور اس کے مہمان بُت بنے سُنتے رہے۔ اس کی باتیں ہی ایسی تھیں کہ سُننے والے کا جی سُنتے سُنتے سیر نہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد کل کے پروگرام پر باتیں ہونے لگیں۔ عاقل نے کہا کہ ہم لوگ شِکار کے بعد وہاں سے روانہ ہو جائیں

گے۔ لیکن جابِر خاں نے یہ تجویز ماننے سے انکار کر دیا۔

”یہ نہ ہو گا صاحب۔ کُچھ تو مُجھے خدمت کا موقع دیجیے۔ شکار کے لیے دس پندرہ روز چلیں گے پھر آپ بے شک اُدھر ہی سے چلے جایئے گا۔ یہ میرے اصول کے خلاف ہے کہ مہمان کو اتنی جلدی رُخصت کر دوں۔ برسوں کے بعد تو کہیں نئے آدمی کی صورت نظر آتی ہے۔“ جابِر خاں کہنے لگا۔

جب اس نے بہت زور دیا تو عاقِل شکار کے بعد واپس آ کر دس دن جابِر خان کے ہاں قیام کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ دوپہر کے کھانے تک یہ لوگ اسی جگہ بیٹھے رہے۔ جب جابِر خاں کے خاص خادِم یاقُوت نے اِطّلاع دی کہ دستر خوان لگایا جا چکا ہے تو سب اُٹھ کر اندر چلے۔

”خِضر خاں، اس وقت تم میرے بجائے میز بانی کا فرض سنبھالو۔ میں ذرا اپنے دوسرے مہمانوں کی بھی خبر گیری کر آؤں۔“ جابِر خاں نے خِضر خاں سے کہا۔

”مجھے خوشی منظور ہے۔“ خِضر خاں کہنے لگا۔

اس پر جابِر خان صدر دروازے کے ساتھ والی راہداری میں مُڑ گیا اور یہ لوگ آگے چلے گئے۔ کھانا اُسی کمرے میں لگایا گیا تھا جس میں صُبح ناشتا کیا تھا۔ کھانا

نہایت پر تکلّف تھا۔ قِسم قِسم کے کھانوں کی خُوشبو سے اُن کی بھُوک چمک اُٹھی اور سب نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ دستر خوان پر تازہ میوے کے طشت چُنے جا رہے تھے کہ ایک خادِم جابِر خاں کا پیچوان لے کہ اندر آیا۔ یہ اس کی آمد کا سگنل تھا۔ تھوڑی دیر بعد کے پردہ اُٹھااور جابِر خاں اندر داخل ہوا۔

"خِضر خاں، اُمّید ہے میرے مہمانوں کو تُم نے بھُوکا نہیں رہنے دیا ہو گا اور میزبانی کے فرائض اچھّی طرح انجام دیے ہوں گے۔" جابِر خاں ہوئے کہنے لگا۔

"جی ہم نے انہیں اصرار کرنے کی تکلیف ہی نہیں دی۔ خوب سیر ہو کر کھایا پیا۔" عاقل نے کہا۔ خادِم نے ایک ایک چھُری اور خالی پلیٹ ہر ایک کے سامنے رکھ دی۔

"بسم اللہ کیجیے۔" جابِر خاں نے پھلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مہمانوں سے کہا۔ اور خود ایک بڑا سا عنبری سیب اُٹھا کر چھیلنے لگا۔ باقی سب نے بھی اپنی اپنی پسند کے پھل اُٹھائے اور باتوں کے ساتھ ساتھ کھانے کا شغل بھی جاری رہا۔

خوفناک جنگ

سیر تو اچھی خاصی ہو گئی کہ شکار کی مہم کُچھ یونہی سی رہی۔ ہرنوں کی تلاش میں یہ لوگ کئی میل آگے نکل گئے۔ ایک رات راستے میں قیام کیا۔ صحرا میں خیمے لگا کر ان کے اِرد گرد آگ کے بڑے بڑے الاؤ جلا دیے تا کہ جنگلی جانور حملہ نہ کریں۔ مگر جہاں یہ درندوں سے بچاؤ کی تدبیر تھی وہاں صحرائی ڈاکوؤں کو دعوت دینے والی بات بھی تھی۔ جابِر خان نے عاقل اور اس کے ساتھوں کو خیموں کے اندر بے فکر ہو کر سو جانے کو کہا اور خود اپنے خادموں کے ساتھ باہر پہرہ دینے لگا۔ خِضر خاں نے جب بہت اصرار کیا تو جابِر خاں نے اُسے بھی اپنے پاس بٹھا لیا۔

اُدھر عاقل اور قاسم بھی خیمے میں جاگ رہے تھے۔ عاقل تھوڑی دیر بعد اُٹھ کر باہر جھانک لیتا اور جابِر خاں اور خِضر خاں کو الاؤ کے پاس بیٹھے دیکھ کر پھر اپنے بستر پر واپس آجاتا۔

"تم سو کیوں نہیں جاتے؟ آخر تمہیں خطرہ کیا ہے؟" تنگ آکر قاسم نے کہا۔

پہلے تو عاقل نے کچھ جواب نہ دیا لیکن قاسم کے بار بار پوچھنے پر اسے کہنا پڑے۔

"مجھے یہ جابِر خاں کُچھ پر اسرار سا معلوم ہوتا ہے۔"

"وہ کیسے؟ اس قدر مہمان نواز میزبان کے متعلق خواہ مخواہ شبہ کرنا بری بات ہے۔ تمہاری کچھ عادت ہی ہو گئی ہے ہر بات میں بد گمانی کرنے کی۔" قاسم نے بیزاری سے کہا۔ اسے نیند تنگ کر رہی تھی اور عاقل اسے سونے نہیں دیتا تھا۔

"جابِر خاں نے بے شمار مہمان اپنے ہاں جمع کر رکھے ہیں اور وہ انہیں خوب کھلا پلا کر پہلوان بنا رہا ہے۔ مُجھے تو اس میں کوئی بھید معلوم ہوتا ہے۔" عاقل دبی آواز میں کہہ رہا تھا۔

”بھئی واللہ عجیب قسم کے آدمی ہو۔ خدا بچائے تم سے۔ اس قدر تو وہ تُواضع اور مہمان داری کر رہا ہے اور تم اس پر شُبہ کرنے لگے۔“ قاسم نے ملامت کرتے ہوئے کہا۔

”نہ مانو۔ تم نے ضِد کر کے پوچھا تو میں نے اپنا خیال ظاہر کر دیا۔“ عاقل نے کہا۔

”لیکن کُچھ پتا بھی ہے کہ آخر تمہارا خیال کیا ہے؟ وہ کیوں لوگوں کی اس طرح ٹہل سیوا کرتا ہے؟“ قاسم نے چِڑ کر پُوچھا۔

”میرا خیال ہے وہ انہیں غلام بنا کر بیچتا ہے۔ ان علاقوں میں چوری چھُپے اب تک غلاموں کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ ہٹّے کٹّے غلام اچھّی قیمت پر بِک جاتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے جابِر خان کا یہی پیشہ ہے۔“ عاقل کہنے لگا۔

”نہیں نہیں۔ ایسا وہم دل میں نہ لاؤ۔ خِضر خاں کہہ رہا تھا کہ وہ ریشم اور دواؤں کی تجارت کرتا ہے۔ اس کے ہاں بڑے بڑے قابِل حکیم نوکر ہیں۔ شمالی سمت جو بہت بڑی سنگین عمارت ہے وہاں کئی قسم کے معجون اور مرہم تیّار ہوتے ہیں۔ ایک خاص مرہم جس کا نام ’مومیائی‘ ہے ایسی اکسیر چیز ہے کہ اس سے خطرناک

گائو تو دِنوں میں بھر آتا ہے۔ اور تو اور سرطان اور ناسور جیسے موذی مرض اس سے اچھّے ہو جاتے ہیں۔"

"تمھیں یہ باتیں خِضر خان نے کب بتائیں؟ میں کہاں تھا؟"

"کل دوپہر جب کھانے کے بعد تم سونے کے لیے چلے گئے تو وہ میرے کمرے میں آ بیٹھا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔" قاسم نے بتایا۔

"مگر میرے دل میں خبر نہیں کیوں رہ رہ کر شک پیدا ہو رہا ہے۔ مُجھے تو یہ آدمی کُچھ پراسرار اور جرائم پیشہ معلوم ہوتے ہیں۔" عاقل کہنے لگا۔

"نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ تمہارا وہم ہے اور وہم کا علاج لُقمان کے پاس بھی نہیں۔"

"خیر چھوڑو، اب تو آ ہی پھنسے ہیں۔ جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔ چلو ہم بھی باہر چل کر بیٹھیں۔ نیند نہیں آ رہی۔" عاقل نے کہا۔

”چلو۔۔۔“ قاسم فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں لڑکے بے خبر سوئے تھے۔ وہ دونوں خیمے سے نکل کر الاؤ کے پاس پہنچے جہاں خِضر خاں اور جابِر خاں بندوقیں تھامے آگ کے قریب پتھروں پر بیٹھے تھے۔ قدموں کی آہٹ پا کر وہ چونک کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور بندوقیں سیدھی کرتے ہوئے پکار اُٹھے۔ ”کون ہو تم لوگ؟ “

قاسم ہنسنے لگا۔

”اوہو۔ آپ ہیں۔ میں سمجھا ڈاکو آ گئے۔“ جابِر خاں ہنس کر کہنے لگا۔

”نیند نہیں آ رہی تھی۔ ہم نے سوچا آپ کے پاس چل کر بیٹھیں۔ باتوں میں وقت اچھا کٹ جائے گا۔“ عاقل کہنے لگا۔

وہ آگ کے گرد بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے یہاں تک کہ دِن چڑھ آیا۔ جابِر خاں اور خِضر خاں تو پڑ کر سو رہے اور عارف اور اعظم کے اصرار پر قاسم اور عاقل قریب کی پہاڑیوں کی طرف شکار کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ پہر دن چڑھے جب وہ واپس اپنے کیمپ کی طرف آئے تو کئی پرندوں کے علاوہ ایک

چھوٹا سا ہرن بھی شکار کر کے لائے مگر وُہ کستُوراہرن نہ تھا۔ اپنی اس مہم کے ناکام رہنے پر وہ کافی بد دِل ہوئے اور اسی دوپہر کو واپس روانہ ہو گئے۔ منزل پر پہنچتے ہی عاقل نے عارف اور اعظم سے کہا کہ وہ جابِر خاں سے واپسی کی اجازت مانگیں کیونکہ وہ خود چند روز اور رہنے کا وعدہ کر چکا تھا۔ مگر جابِر خاں نے ایک نہ سُنی اور کہہ دیا کہ تمہارے بڑے بھائی وعدہ کر چکے ہیں کہ شِکار سے واپس آ کر دس روز تک یہیں رہیں گے۔

"ہمارا قافلہ حلب سے واپس آئے گا تو آپ کو تُحفے تحائف دے کر بھیجیں گے۔ یہاں آ کر کوئی تُحفہ لیے بغیر چلا جائے، یہ ممکن نہیں۔" جابِر خان نے لڑکوں کو تسلّی دیتے ہوئے کہا۔

ان سب کی بھی دوسرے مہمانوں کی طرح خوب خاطر خدمت ہوتی تھی۔ ایک ایک خادِم ہر وقت خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ دوپہر کو ان کی زیتون کے تیل سے مالش کی جاتی۔ عجیب و غریب کھانے پیش کیے جاتے۔ بستر سے اُٹھتے ہی بادام کی سردائی پینے کو ملتی۔ رات کو سونے سے پہلے نہایت خوش ذائقہ حریرہ دیا

جاتا۔ دس دن کے اندر ہی اندر ان سب کا رنگ روپ نکھر گیا اور وہ خُوب توانا نظر آنے لگے۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتے تھے، گیارہویں روز صُبح ہی انہیں خِضر خاں نے اپنے میزبان کی طرف سے پیغام دیا کہ اگر وہ چاہیں تو ڈاکوؤں کو گرفتار کرنے کی مہم میں حصّہ لینے کے لیے اُن کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ وہ ڈاکو جسے وہ لوگ زخمی حالت میں اُٹھالائے تھے اب تندرست ہو چکا تھا اور جابِر خاں کی خاطر داری سے اس حد تک اُس کا دوست بن گیا کہ اپنے ساتھیوں کو گرفتار کرانے کے لیے اس کی مدد کرنے پر تیّار ہو گیا۔ خِضر خان کی تجویز پر عاقل اور اس کے تینوں ساتھی بھی اُس مُہم میں حصّہ لینے کو تیّار ہو گئے۔

وہ تیّار ہو کر آئے تو جابِر خان کو مع ہتھیار بند دستے کے منتظر پایا۔ چہار دیواری کے باہر اُن کے گھوڑے بھی موجود تھے۔ سب لوگ سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ ڈاکو کے بیان کے مطابق اس کے ساتھیوں کی تعداد ڈیرھ سو کے قریب تھی۔ جابِر خان نے اُن کے مقابلے کے لیے صرف اسّی آدمی لے جانا مناسب خیال کیا کیونکہ اس کے سپاہی بڑے بہادر اور لڑائی کے گُر میں پوری طرح ماہر تھے۔

سارے دن کے سفر کے بعد وہ لوگ شام ہوتے ہوتے ایک سرسبز پہاڑی علاقے میں پہنچے۔ اُونچی اُونچی پہاڑیاں گھنی جھاڑیوں سے پٹی پڑی تھیں۔ گہری گہری گھاٹیوں میں بھی سبزہ تھا۔ وہ لوگ ڈاکو کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ جب وہ اُنہیں لے کر ایک گھاٹی پر سے اُترا اور ایک پہاڑی نالے کے کنارے کنارے چلنے لگا تو جابِر خاں کو یکایک کُچھ خیال آیا۔ اس نے ڈاکو سے کہا:

"دیکھو صابر خاں، میری ایک بات غور سے سُن لو۔"

"فرمایئے۔ کیا حکم ہے؟" صابر خان یعنی وہی ڈاکو ادب سے پوچھنے لگا۔

"اگرچہ مجھے تم پر پورا پورا بھروسا ہے۔ پھر بھی میں احتیاطاً ایک دفعہ اور تمہیں تاکید کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھ سے دغا کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ یاد رکھو کہ جابِر خان جس قدر دوست نواز ہے اُسی قدر بے وفائی کرنے والے ساتھی کے حق میں قہر اور غضب ہے۔ وہ اُسے کبھی زندہ نہیں چھوڑتا۔"

جابِر خان نے غضب ناک نگاہوں سے اُسے گھُور کہ کہا تو صابر خاں سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ پھر اُس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے کہا:

”آپ میرے متعلّق کسی شُبے کو دِل میں نہ لائیۓ مالک۔ میں تو آپ کا خادم ہو چکا۔ آپ نے میری جان بچائی ہے اور اب میری جان آپ کی خدمت کے لیے وقف ہے۔“

”بہتر۔۔۔!تو چلو راستہ دکھاؤ۔“

جابِر خان نے اپنی رائفل پر سنگین چڑھاتے ہوۓ اپنے رہنما کو اپنی زَد میں لے لیا تاکہ ذرا سا شک ہوتے ہی اسے نوک پر دھر لے۔ اِتنا یقین دِلانے کے باوجود بھی صابِر خاں آخر ایک ڈاکو ہی تو تھا۔ جس کی بات پر بھروسہ کر لینا جابِر خان کے واسطے ناممکن تھا۔

”میں آپ کو اس راستے سے اسی لیے لے جا رہا ہوں کہ عام راستے سے جانے میں کسی سے سامنا ہو جاتا۔ اب ہم عین اُن لوگوں کے سر پر پہنچ جائیں گے۔“ صابر خاں کہنے لگا۔

وُہ آگے پیچھے چلتے ہوۓ گھاٹیوں کے پیچ دار راستے طے کرتے رہے۔ سبزے کے باعث گھوڑوں کی ٹاپ کی آواز نہیں اُبھرتی تھی۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ ایک

چھوٹی سی پہاڑی کا چکر کاٹتے ہوئے وہ ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں سے سامنے ایک کھُلا میدان دکھائی دیتا تھا جو چاروں طرف سے اُونچی پہاڑیوں سے گھِرا ہوا تھا اور جس میں جابجا خیمے لگے تھے۔ درمیان میں ایک بہت بڑا الاؤ جل رہا تھا اور کئی آدمی کام میں مصروف تھے۔ غالباً وہ شام کا کھانا پکانے کی تیّاری کر رہے تھے۔

یہ لوگ گھوڑوں پر سے اُتر پڑے اور آہستہ آہستہ اس مقام کی طرف بڑھے جہاں خیمے لگے تھے۔ صابِر خال بار بار اُنہیں تاکید کر رہا تھا کہ آہٹ نہ ہونے پائے۔ وہ جابجا پھیلی ہوئی پتھریلی چٹانوں کی آڑ لیتے ہوئے بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ عین اس جگہ پہنچ گئے جہاں ایک بڑے سے تخت پر ڈاکوؤں کا سردار لیٹا ہوا مشعل کی سُرخ روشنی میں کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ چند گز کے فاصلے پر کچھ عورتیں خیمے کے سامنے بیٹھی ہنس بول رہی تھیں۔ ان کے درمیان ایک نہایت خوبصورت عورت تھی جس نے قیمتی لباس اور زیورات پہن رکھے تھے۔ یہ سردار کی بیوی علیمہ تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی سردار کے قریب تخت پر آ بیٹھی۔ سردار نے کتاب ایک طرف رکھ دی اور بیوی سے باتیں کرنے لگا۔

عاقل اور اس کے ساتھی سامنے والی چٹان کے پیچھے سے جھانک کر یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں تین چار لڑکیاں آئیں۔ ایک دف بجانے لگی، دوسری نے بربط سنبھالا اور تیسری ناچنے لگی۔ مگر سردار نے بے چین سا ہو کر پہلو بدلا اور ہاتھ کے اشارے سے ان لڑکیوں کو واپس جانے کا حکم دیا۔ بیوی کے پوچھنے پر اس نے چاروں طرف غور سے نگاہ ڈالی اور لمبا سانس لے کر کہنے لگا:

"خبر نہیں کیوں میرا دِل بے چین ہے۔ مُجھے اپنے ماحول میں کچھ اجنبی سی بُو آتی ہے۔ میری چھٹی حس خطرے کا احساس دِلا رہی ہے۔ میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے کئی آنکھیں مجھے گھور رہی ہوں۔"

جابِر خان سردار کی یہ بات سُن کر حیران تو ہوا مگر اب زیادہ اِنتظار یا سوچ بچار کا وقت نہ تھا۔ اس نے ایک دم فائر کر دیا اور اس کا یہ اشارہ پاتے ہی کمین گاہ میں چھُپے ہوئے اس کے ساتھیوں نے بھی تابڑ توڑ فائر شروع کر دیے۔ خیموں سے تمام ڈاکو اپنے اپنے ہتھیار سنبھالے ہوئے نکل آئے۔ اس وقت تک سردار زخمی ہو چکا تھا مگر اس کے باوجود مقابلے پر تیّار تھا۔ اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ

بندوق سنبھالے موجود تھی۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ سرکتے ہوئے ایک چٹان کی اوٹ میں ہو گئے اور فائر کی سمت کا اندازہ کر کے خُود بھی اندھا دھند گولیاں برسانے لگے۔ سُن ساں پہاڑیاں فائروں کی آواز سے گونجنے لگیں۔

جابِر خان کے آدمی محفوظ کمین گاہوں سے گولیاں برسا رہے تھے۔ مگر ڈاکو میدان میں تھے جنہیں حملہ آوروں نے اپنی زد میں لے لیا تھا۔ ان کے نشانے ٹھیک بیٹھ رہے تھے اور ڈاکو ایک ایک کر کے زخمی ہو کر گرتے جا رہے تھے۔ جو باقی تھے انہوں نے مُقابلہ بے سود سمجھ کہ اِدھر اُدھر چھُپنا شروع کیا۔ مگر جابِر خاں کے آدمیوں نے ناکا بندی کر کے اُن کے گرد حلقہ باندھ لیا اور کِسی ایک کو بھی بچ کر نکلنے نہ دیا۔ جب ڈاکوؤں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر گرفتار کر لیا گیا تو جابِر خاں نے دیکھا کہ اُن میں سردار نہیں ہے۔ اس نے سردار اور اس کی بیوی کو تلاش کرنے کا حکم دیا۔ اُس کے آدمی پھر پہاڑیوں میں پھیل گئے اور سردار کی تلاش کرنے لگے۔ انہیں ایک پہاڑی پر دو سائے نظر آئے انہیں نے چاروں طرف سے اس پہاڑی کو گھیر لیا اور اوپر چڑھنے لگے۔ سردار اور اس کی بیوی نے جابِر

خاں کے بہت سے آدمیوں کو مارا اور جب دیکھا کہ اب اُس کے بچنے کی کوئی سبیل نہیں تو اُس نے پہاڑی کی چوٹی پر سے للکار کر کہا:

”موذیو، تُم جو کوئی بھی ہو، میں تم پر ہزار لعنت بھیجتا ہوں اور تمہارے ہاتھوں گرفتار ہونے پر موت کو ترجیح دیتا ہوں۔“

اس کے بعد دو فائر ہوا میں گونجے۔ سردار نے پہلے اپنی بیوی کو مارا اور پھر اپنی کنپٹی میں گولی مار کر خودکُشی کرلی۔

جابِر خاں کے آدمیوں نے مالِ غنیمت سمیٹا۔ سردار کے خیمے سے بے شمار دولت اور قیمتی سامان برآمد ہوا۔ جسے گٹھڑیوں میں باندھ کر ڈاکوؤں کے سر پر رکھا اور اُن کی کمر کے گرد رسّیاں باندھ کر انہیں ساتھ لے چلے۔ سردار کے اصطبل میں بہت سے گھوڑے تھے وہ بھی جابِر خان نے اپنے قبضے میں لیے اور پھر واپسی کا حکم دیا۔

تم نہیں جا سکتے

عاقل اور اُس کے ساتھی اگرچہ اس مُہم میں شوق سے شریک ہوئے تھے لیکن اس کامیابی پر اُنہیں ذرا بھی خوشی نہ ہوئی۔ کیونکہ جس طریقے سے جابِر خاں کے آدمیوں نے ڈاکوؤں پر حملہ کر کے اُنہیں مارا اور گرفتار کیا وہ انہیں بالکل پسند نہ آیا تھا۔ یہ کوئی آمنے سامنے کا بہادرانہ مقابلہ نہ تھا بلکہ محض ڈاکوؤں پہ ڈاکہ ڈالنے والی بات تھی۔

"مجھے تو سخت شرمندگی ہے کہ ایسی مُہم میں خُود بھی شریک ہوا اور تم لوگوں کو بھی شریک ہونے کا مشورہ دیا۔" عاقل نے افسوس ناک لہجے میں اپنے ساتھیوں

سے کہا۔

”ہاں، میرا دِل بھی بہت آزردہ ہے۔ خصوصاً سردار اور اس کی بیوی کے اس طرح مرنے کا تو مُجھے بے حد صدمہ ہے۔ خِضر خاں بھی کہہ رہا تھا کہ کاش ہم لوگ جابِر خان کے ساتھ نہ گئے ہوتے۔“ قاسم کہنے لگا۔

”ہاں اُسے بھی سردار کی بیوی کی موت کا بہت افسوس ہو رہا ہے۔“ عاقل نے کہا۔

”بھائی جان، سردار کو خطرے کا احساس کیونکر ہوا؟ وہ کہہ رہا تھا نا کہ مُجھے ماحول میں اجنبی سی بُو آرہی ہے۔“ عُرفی نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ان لوگوں میں جو ہر وقت اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں، ایک چھٹی حِس پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنے گرد و پیش کسی خطرے کو اس طرح لیتے ہیں جیسے جانور دُشمن کی بو پہچان لیتے ہیں۔“ عاقل نے جواب دیا۔

”کتنی عجیب بات ہے۔“ لڑکے کہنے لگے۔

دو چار روز بعد عاقل نے ارادہ کیا کہ اپنے میزبان کا شکریہ ادا کر کے روانگی کی اجازت مانگے۔ چنانچہ ایک صُبح جب وہ ناشتے کے دستر خوان پر آئے تو جابِر خان موجود نہ تھا۔ حالانکہ ہر روز تو وہ ان سے پہلے ہی موجود ہُوا کرتا تھا۔ عاقِل نے مناسب خیال کیا کہ خِضر خاں آ جائے تو وہ جابِر خاں سے اُس کی موجودگی میں رُخصت چاہے۔ وہ اس کے اِنتظار میں دستر خوان پر بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔

"آپ صاحبان ناشتا شروع کریں۔" جابِر خاں کہنے لگا۔

"خِضر خاں تو آ جائیں۔ آج انھوں نے خبر نہیں کیوں دیر کر دی۔" قاسم کہنے لگا۔
جابِر خان ہنس دیا۔ بولا:

"آپ بسم اللہ کریں صاحب۔ اُن کا انتظار نہ کریں۔ رات اچانک گھر سے کُچھ پیغام ملا تو انہیں فوراً روانہ ہونا پڑا۔ آپ آرام کر رہے تھے اس لیے وہ مِل کر نہ گئے۔"

یہ سُن کر وہ سب حیران ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

”مگر وہ ہمارے بغیر کیونکہ چلے گئے؟ ان کا فرض تھا کہ ہمیں اِطّلاع کرتے اور ساتھ لے کر جاتے۔ آخر ہم لوگ ان کے ساتھ آئے تھے۔“

عاقل کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور جابِر خاں کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ مگر جابِر خاں بے پروائی سے حقّے کے کش لیتا رہا اور کچھ نہ بولا۔ مگر جب کئی منٹ تک ان لوگوں نے کھانے کی طرف توجّہ کی تو اُسے کہنا پڑا:

”دوستو، آپ ناشتا تو کیجیے۔ اس قدر گھبرانے کی کیا بات ہے۔ کیا آپ خِضر خاں کے بغیر واپس نہیں جاسکتے؟“

”جا کیوں نہیں سکتے۔ لیکن خِضر خاں ہمیں لے کر آئے تھے ساتھ ہی لے کر جاتے۔“ عاقل نے کہا۔

”خیر یہ کوئی ضُروری نہیں۔ آپ اِطمینان سے ناشتا کیجیے۔ چھوڑیے اس بحث کو۔“ جابِر خاں نے روکھے سے لہجے میں کہا۔

اس کا یہ رویہ اُن لوگوں کو کھٹکا تو سہی مگر خاموشی سے ناشتا کرنے لگے۔ فارغ ہو کر

عاقل نے اپنی اور اپنے دوستوں کی طرف سے پہلے تو موزوں لفظوں میں اپنے میزبان کا شکریہ ادا کیا اور پھر جانے کی اجازت مانگی۔ اس پہ جابِر خاں عجیب طرح قہقہہ لگا کر ہنسا اور بولا:

"میرے عزیز، میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ میں اپنے مہمانوں کو آسانی سے جانے کی اجازت نہیں دیا کرتا۔ اس جنگل میں اکیلا پڑا ہوں اِسی لیے اپنے گرد دوستوں کا ہجوم چاہتا ہوں۔ میرے پہلے مہمانوں میں سے کئی جانے والے ہیں۔ ان کی جگہ آپ کو لینی ہو گی۔"

"تو گویا ہم اپنی مرضی سے جا نہیں سکتے؟" قاسم نے حیران ہو کر پُوچھا۔

"اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہم آپ کی قید میں ہیں؟" عاقل نے پوچھا۔

"جو بھی آپ سمجھ لیں۔ یہ تو سمجھنے کی بات ہے۔" جابِر خاں نے سنجیدہ ہو کر جواب دیا۔

دونوں لڑکے دہشت زدہ سی صُورت بنائے ایک ایک کا مُنہ تک رہے تھے۔

”آپ ہمیں صاف صاف بتائیں کہ یہ معاملہ کیا ہے؟“ عاقل نے خفگی سے پوچھا۔

”بتادیں گے۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ آپ مزے سے کھائیں پیئیں، سیر کریں۔ کھیل اور تفریح کے سامان موجود ہیں۔ چند دِن زندگی کا لطف لیں۔ باہر کی دنیا میں اِس سے بڑھ کر کیا رکھا ہے جس کے لیے آپ اس قدر گھبرا رہے ہیں؟“

جابِر خاں نے پھر دوستانہ لہجہ اختیار کر لیا۔ لیکن اب عاقل سے زیادہ قاسم اس کے سر پر سوار تھا اور واپسی کا تقاضا کر رہا تھا۔ آخر نوبت جھگڑے تک پہنچ گئی اور جابِر خان غضب ناک ہو گیا۔

”اگر تم اصل بات جاننا ہی چاہتے ہو تو سن لو۔ میں نے خِضر خاں کو تم چاروں آدمیوں کے عوض ایک بہت بڑی رقم دی ہے۔ وہ تمھیں میرے پاس بیچنے کی غرض سے لایا تھا اور بیچ کر چلا گیا۔ اب زیادہ سوال جواب کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ تمھاری کوئی کوشش بھی تُمھیں اس جگہ سے نکلنے میں مدد نہیں دے سکتی۔ اس لیے ہر کوشش فضُول ہو گی۔ تمھارے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ اسی چار دیواری کو فی الحال اپنی دنیا سمجھو اور یہاں رہ کہ بے فکری سے کھاؤ پیو،

عیش کرو۔" اس نے تیز لہجے میں کہا اور جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"مگر یہ سب کیا ڈھونگ ہے؟ تم کیوں لوگوں کو غلام بنا کر یہاں رکھتے ہو؟" عاقل نے غصّے سے پُوچھا۔

"بس یوں سمجھ لو کہ اپنا وقت گزارنے کے لیے۔" جابِر خاں کہنے لگا۔

"یہ غلط ہے۔" عاقل نے چیختے ہوئے کہا۔

"تو پھر تُم جو کُچھ بھی سمجھ لو۔ کیا فرق پڑتا ہے۔"

اتنا کہہ کہ جابِر خاں اپنے بھاری بھر جسم کو لڑھکاتا ہوا پیچھے کے کمرے میں غائب ہو گیا۔ عاقل اور قاسم سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ اعظم اور عارف دہشت کے مارے زرد پڑ گئے اور ان کی آنکھوں کے سامنے اپنے والدین کے غمگین چہرے اُبھرنے لگے۔

گونگا بولنے لگا

اُس دِن کے بعد جابِر خاں نے اُنہیں اپنے کمرے میں دستر خوان پر بلانا چھوڑ دیا اور انہیں کھانا اور ناشتا الگ ملنے لگا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ رنج و غم سے ان لوگوں کی بھوک پیاس جاتی رہتی مگر ہوا یہ کہ اُن کی بھُوک میں کوئی فرق نہ آیا۔ شاید انہیں مزیدار حلوے ہی میں ایسی دوائی کھلا دی جاتی تھی جس سے خوب بھوک لگتی تھی۔ ان کے اکٹھے بیٹھے اُٹھنے پر بھی کوئی پابندی نہیں لگائی گئی تھی البتہ دوسرے مہمانوں کے پاس جا کر بیٹھنے اور اُن سے بات چیت کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اس کے علاوہ ان کے ہتھیار بھی لے لیے گئے تھے۔

وہ چاروں بظاہر سیر کرتے ہوئے دُور دُور تک نکل جاتے اور باغ اور محل کے پچھواڑے کے جنگل میں گھنٹوں گھوما کرتے۔ وہ دراصل چہار دیواری کے قریب کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھے جہاں سے باہر کی طرف کُودا جا سکے۔ لیکن یہ ساری تلاش بے کار تھی۔ چار دیواری کم از کم ۱۴ فٹ اُونچی تھی اور دیوار کے ساتھ ساتھ اس قدر گھنے سرکنڈے اور جھاڑ جھنکار تھے کہ قدم تک رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ وہ طرح طرح کی تدبیریں سوچتے مگر ہر تدبیر بے کار ثابت ہوتی۔

اسی طرح چھ مہینے گزر گئے۔ ایک صُبح ان لوگوں کی حیرانگی کی حد نہ رہی جب انہوں نے عاقل کو کمرے میں موجود نہ پایا۔ رات اُسی کے کمرے میں سب نے کھانا کھایا تھا۔ وہ اپنے بستر پر لیٹ گیا تھا۔ یہ تینوں اس کے قریب فرش پر بیٹھے ہوئے باتیں کرتے رہے تھے اور خاصی رات گئے اُٹھ کر اپنے اپنے کمرے میں آ ئے تھے۔ عاقل یقیناً جلد ہی سو گیا ہو گا لیکن یہ خبر نہیں کیا بھید تھا کہ صُبح وہ اپنے کمرے سے غائب تھا۔ انہوں نے پہلے تو اُسے باہر چمن میں تلاش کیا۔ جب نہ ملا تو وہ جابِر خاں کے پاس پہنچے اور اپنے ساتھی کے بارے میں پوچھا۔ جابِر خاں

پہلے تو چُپ چاپ مُسکراتا اور حقّے کے کش لگاتا رہا۔ پھر بڑی بے پروائی سے بولا:
"تمہارا دوست اپنے وطن واپس چلا گیا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" قاسم نے حیرت سے کہا۔

"مگر ہوا تو یہی۔ اُس نے ایک بہت بڑی رقم کے عوض اپنی آزادی ہم سے خرید لی۔" جابِر خاں ہنس کر بولا۔

"لیکن اس کے پاس تو کچھ اتنی زیادہ رقم نہ تھی۔" قاسم کہنے لگا۔

"اسی لیے تو وہ ہمارے ایک آدمی کو اپنے ساتھ لے کر گیا ہے۔ گھر جا کر اُسے رقم دے گا اور اگر شرارت کرنے کی کوشش کی تو وہیں مار ڈالا جائے گا۔"

"کتنی رقم میں سودا ہوا۔" قاسم نے پوچھا۔

"بہت بڑی رقم۔۔۔ تم اتنی رقم نہیں دے سکتے۔ اِس لیے پُوچھنا فضول ہے۔۔۔ جاؤ جا کر آرام کرو اور عاقل کے متعلق سوچنا چھوڑ دو۔"

جابِر خان نے کہا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ گویا اس مضمون پر زیادہ گفتگو

کرنے کو تیّار نہیں۔

”یہ قصّہ جو اُس کے متعلق تم بتاتے ہو، سراسر غلط ہے۔ میں عاقل کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ جان دے سکتا تھا مگر دوستوں کو خطرے میں چھوڑ کر یوں ہرگز نہیں جا سکتا تھا۔“ قاسم نے پاگلوں کی طرح چیختے اور فرش پر پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔

سنگ دِل جابِر خاں زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا۔

”تمھیں یہاں کیسا خطرہ ہے بھائی۔ بادشاہوں کی طرح زندگی گزار رہے ہو۔ نہ فکر نہ اندیشہ۔ نہ کام نہ کاج۔ اور کیا چاہیے تمھیں؟“

”ہم باز آئے ایسی شاہانہ زندگی سے۔ آزادی لاکھ بادشاہیوں کی ایک بادشاہی ہے۔ ہمیں بتاؤ کہ کتنا روپیہ دے کر ہم اپنی آزادی تم سے خرید سکتے ہیں؟ ہمارے ساتھ بھی اپنا آدمی بھیج دو۔ ہم روپیہ ادا کر دیں گے۔“ قاسم نے کہا۔

جابِر خاں اور بھی زور سے ہنسا اور بولا۔

"تمہارے دوست نے ہی مجھے بتایا تھا کہ اِتنی رقم نہ دے سکو گے۔ اب زیادہ بحث فضُول ہے۔"

"اچھا تو عاقل ٹھیک ہی کہتا تھا۔ تمہارا پیشہ بُردہ فروشی ہے۔ تم نے ضُرور اُسے بیچ دیا ہے اور غُلام بنا کر کوئی اسے لے گیا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے ہر گز نہیں گیا۔ ظالم، سنگ دِل۔ خُدا تُجھے غارت کرے۔" قاسم نے رونے کے قریب ہو کر کہا۔

"دیکھو، زبان سنبھال کر بات کرو میرے دوست۔ اگر تُم میرے مہمان نہ ہوتے تو خدا کی قسم تمہاری زبان کھنچوا دیتا۔" اور وہ بڑبڑاتا ہوا پچھلے کمرے کا پردہ اُٹھا کر اندر چلا گیا۔

"خدا اس شیطان کو غارت کرے۔ اس نے خبر نہیں عاقل کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ وہ ہر گز اپنی مرضی سے نہیں گیا۔" قاسم نے کہا۔ پھر وہ لڑکوں کو ساتھ لے کر اپنے کمرے میں آیا اور بستر پر بیٹھ کر بچّوں کی طرح بِلک بِلک کر رونے لگا۔ اسے عاقل سے بھائی سے بھی زیادہ محبت تھی۔ وہ کئی سال سے اکٹھے سیر و شکار پر جاتے تھے اور اب وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ اسے یُوں روتے دیکھ کر اعظم اور عارف بھی

سسکیاں لے لے کر رونے لگے۔ اتنے میں ان کا خادِم، گونگا حبشی کمرے میں داخل ہوا۔ وہ پانی کی صُراحی رکھنے آیا تھا۔ صراحی رکھ کر وہ چند قدم دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور ان تینوں کی طرف رحم بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ اُس کے چہرے پر ہمدردی کے آثار دیکھ کر قاسم نے اُس سے پوچھا:

"بھائی، اگر تمہیں ہمارے ساتھی کے بارے میں کُچھ پتا ہو تو بتاؤ۔"

گونگے نے اشارے سے سمجھایا کہ بتاؤں کیسے؟ میری تو زبان ہی نہیں۔

"خیر، اشاروں ہی سے کُچھ سمجھاؤ۔ اور ہم مظلوموں کی کُچھ مدد کر سکتے ہو تو کرو۔"

یہ کہہ کر قاسم نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ دونوں لڑکے پہلے ہی گھبرائے ہوئے تھے۔ قاسم کی حالت دیکھ کر ان کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ گھر کو یاد کر کر کے زار زار رونے لگے۔

حبشی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اپنی آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے

انہیں اشارے سے سمجھایا کہ وہ باغیچے میں چلیں۔ وہ بھی اُن کے پیچھے آتا ہے۔ وہ فوراًہی اُٹھے اور باغیچے کی طرف چلے تو حبشی گونگا، جس کا نام ضیغم تھا، قالین تکیے اور مالش کے لیے زیتون کے تیل کی بوتل لیے ان کے پیچھے پیچھے آیا۔ اس روز وُہ بہت دُور ایک ایسے گوشے میں پہنچے جہاں دھوپ بھی تھی اور سایہ بھی۔ سردیاں ختم ہو رہی تھیں اور گرمیوں کی آمد آمد تھی۔ دھوپ میں خاصی تیزی آگئی تھی۔ دوپہر کو سایہ اور ٹھنڈی ہوا سکُون دیتی تھی۔

ضیغم نے قالین بچھا کر تکیے لگا دیے اور کچھ دیر غور سے قاسم کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر ہمدردی کے آثار تھے۔ پھر اس نے لمبا سانس کھینچا اور آگے بڑھ کر روزمرہ کی طرح قاسم کی پنڈلیوں پر مالش کرنے لگا۔

"ہاں تو ضیغم بھیّا، تمہیں میرے دوست کے مُتعلّق کُچھ معلوم ہے؟" قاسم نے پوچھا۔

"معلوم ہے۔" ضیغم نے سر ہلا کر کہا۔

وہ تینوں چونک پڑے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کا مُنہ تکنے لگے۔

"تُم۔۔۔ تُم بول سکتے ہو؟ "

"ہاں۔۔۔۔"

"تو پھر اتنی مدّت گونگے کیوں بنے رہے؟" عارف نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میں اب بھی گونگا ہی بنا رہتا لیکن آپ لوگوں کی حالت دیکھ کر میرا دل پھٹ گیا۔ آپ یہ راز کسی پر ظاہر نہ کریں۔ ورنہ زبان تو کیا میری گردن اُڑادی جائے گی۔" وہ کہنے لگا۔

"ہرگز نہیں۔ ہم ایسے احسان فراموش نہیں کہ تمہیں نیکی کا ایسا بدلہ دیں۔" قاسم نے کہا۔

"مجھے آپ لوگوں سے ایک قِسم کا دِلی لگاؤ تو ہو گیا ہے جب محرّم میں آپ جناب امام حسینؑ کے غم میں مرثیے پڑھتے تھے اور وطن جانے کی اس لیے تمنّا کرتے تھے کہ وہاں جاکر محرم مناسکیں۔ میں نے کوشش کی کہ آپ کو کسی طرح یہاں سے نکال سکوں مگر ممکن نہ ہوا۔" ضیغم نے کہا۔

"اچھا تو عاقل کے متعلق جلدی بتاؤ۔ وُہ کہاں ہے؟" قاسم نے بے صبری سے پُوچھا۔

"میں آپ کو بتاوں گا۔ مگر ابھی نہیں۔ اس کے لیے آپ کو رات تک انتظار کرنا پڑے گا۔" وہ کہنے لگا۔

"کیا وہ یہیں ہے؟"

"کل رات تک یہیں تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"تو اب کہاں ہے؟"

"سب کُچھ بتاؤں گا۔ رات ہونے کا انتظار کیجیے۔"

"اچھا ضیغم، یہ تو بتاؤ تم گونگے کیوں بنے ہوئے ہو۔" عارف نے پوچھا۔

"جابِر خاں اپنے محل میں، مہمانوں کی خدمت کے لئے گونگے خادم ہی رکھتا ہے۔ لیکن وہ پیدائشی گونگے نہیں ہوتے۔ وہ اُن کی زبانیں کٹوا دیتا ہے۔"

وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ دونوں لڑکے چیخ اُٹھے۔ "کہیں وُہ ہماری زبانیں بھی تو نہیں

کٹوا دے گا؟"

"نہیں آپ کی زبانیں نہیں کٹوائے گا۔" ضیغم نے یقین کے لہجے میں کہا۔

"ہمیں اس نے کِس غرض سے یہاں قید کر رکھا ہے؟ وہ ہم سے کیا سلُوک کرے گا؟" قاسم نے پوچھا۔

"جو سلوک آپ کے دوست سے کیا۔" ضیغم نے جواب دیا۔

"کیا سلوک کیا اس بدبخت نے میرے عزیز دوست کے ساتھ؟ خُدا کے لیے بتا دو۔۔۔" قاسم اُس کا ہاتھ پکڑ کر منّت سے پوچھنے لگا۔

"اب میں کیا بتاؤں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھے بغیر آپ کو میری بات کا یقین نہ آئے گا۔ میں آپ کو سب کُچھ دکھاؤں گا۔" ضیغم کہنے لگا۔

"اچھّا تو یہ بتاؤ تم کیسے بچ گئے؟ اس نے تمہاری زبان کیوں نہیں کٹوائی؟" اعظم نے پوچھا۔

"جابر خاں اپنے قافلے کے ساتھ مِصر گیا تھا۔ وہیں سے مُجھے ساتھ لے آیا۔ میں

خرطوم کا رہنے والا ہوں۔ یہاں پہنچ کر میں نے اپنے کئی ہم وطنوں کو دیکھا جِن میں ایک شخص کو میں پہچانتا بھی تھا۔ ایک دفعہ میرے باپ نے اُس کی جان بچائی تھی۔ وہ اس کا دوست بن گیا۔ وہ اکثر ہمارے ہاں آیا کرتا تھا۔ جابِر خاں نے، جو ہماری پہلے کی واقفیت سے بے خبر تھا۔ اس سے کہا کہ جن خادموں کی زبانیں کاٹی جانی تھیں انہیں مطب میں حکیم کے پاس لے جائے۔

اُس نے اس گروہ کو دو حصّوں میں کر دیا اور مُجھے الگ کر کے تاکید کر دی کہ میں بہانہ کروں کہ جیسے میری زبان بھی کٹ چُکی ہے اور گونگوں کی طرح اِشاروں سے بات کیا کروں۔ "

"چلو شکر ہے کہ باپ کی نیکی تمہارے کام آگئی۔" قاسم نے کہا۔

"جی ہاں۔ مگر زبان رکھتے ہوئے گونگا بنے رہنا کُچھ کم تکلیف دہ نہیں ہوتا۔" ضیغم نے ہنس کر کہا۔

"ہاں۔ یہ بھی تم ٹھیک کہتے ہو۔" قاسم بولا۔

”اچھا، ہم رات ہونے کا بے چینی سے اِنتظار کریں گے۔“

”رات کے کھانے کے بعد میں آپ کے کمرے میں آؤں گا۔“ ضیغم نے کہا۔

قاسم دونوں لڑکوں کو ساتھ لے کر واپس اپنے کمرے میں چلا آیا۔

ہولناک نظّارہ

وہ تینوں عشا کی نماز سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ضیغم دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا اور قاسم کے کان میں کُچھ کہہ کر جلدی سے واپس چلا گیا۔ قاسم نے وظیفہ ختم کر کے تسبیح تکیے کے نیچے رکھ دی۔ پھر دروازے کی کُنڈی اندر سے بند کر کے لیمپ گُل کر دیا اور کھڑکی کے قریب جا کر غور سے نیچے دیکھنے لگا۔ یہ کمرہ تیسری منزل پر تھا۔ چند لمحے وہ باہر اندھیرے میں گھُورتا رہا پھر ایک دم کھڑکی سے باہر کسی چیز پر جھپٹا۔ لڑکوں نے دیکھا کہ ایک مضبوط رسّا اُس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ کمند نیچے سے ضیغم نے پھینکی ہے۔ رسّے کے سِرے کو

قاسم نے مضبوطی سے کھڑکی نے ساتھ باندھ دیا اور نیچے اُترنے لگا۔

"تم دونوں شاید اس طرح نہ اُتر سکو۔ اچھا ہوتا کہ تُم آرام سے سو جاتے اور میں ضیغم کے ساتھ اکیلا چلا جاتا۔" قاسم نے کہا۔ لیکن اعظم اور عارف کسی طرح بھی اُسے اکیلا بھیجنے پر رضامند نہ ہوئے۔

"نہیں بھائی جان، اب تو جہاں بھی جائیں گے اکٹھے ہی جائیں گے۔" اعظم بولا۔

"ہم تو آپ کو ایک مِنٹ کے لیے بھی اکیلا نہ چھوڑیں گے۔" عارف کہنے لگا۔

"اُتر بھی سکو گے؟" قاسم نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ آپ فکر نہ کریں۔" وُہ دونوں یقین سے بولے۔

قاسم رسّا پکڑ کر کھڑکی کے باہر چلا گیا۔ اس کے بعد باری باری عارف اور اعظم اُترے۔ ضیغم نیچے کھڑا تھا۔ رسّے کے آخری سِرے کو اُس نے کھینچ کر ایک جھاڑی کے پیچھے چھُپا دیا اور اُنہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ محل کے پچھواڑے کا موڑ مُڑ کر وہ اُس گھنے جنگل میں پہنچ گئے جو

دیوار کے ساتھ ساتھ دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ پندرہ بیس منٹ چلنے کے بعد وہ اس الگ تھلگ عمارت کے پچھواڑے پہنچ گئے۔ جسے مَطب کہا جاتا تھا اور جس کی چمنیوں سے دِن رات دھواں نکلتا رہتا تھا۔ مشہور تھا کہ یہاں وُہ جلّاد صُورت حکیم جو ہر ہفتے جابِر خاں کے مہمانوں کا معائینہ کرنے آتا تھا، قِسم قِسم کی دوائیں اور مرہم بنانے میں مصروف رہا کرتا ہے۔ ضیغم نے انہیں ایک درخت پر چڑھا کر پیچھے کی دیوار پر اُتار دیا۔ وہ بڑی دقّت سے برآمدے کی چار انچ چوڑی کارنس پر چلتے اور دیوار سے چپک کر چھپکلی کی طرح رینگتے ہوئے ایک سیڑھی تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے جو اندر کے برآمدے کی چھت سے اُوپر کی منزل تک جاتی تھی۔ اب وہ بلا دِقّت چھت پر پہنچ گئے۔ ضیغم خود بھی پیٹ کے بل لیٹ گیا اور اُنہیں بھی ایسا ہی کرنے کا اشارہ کیا۔ اُس نے سمجھایا کہ چلنے سے نیچے قدموں کی آہٹ ہوگی۔

پیٹ کے بل رینگتے ہوئے وہ اُونچی چمنی کے قریب چھت میں بنے ہوئے ایک چوڑے روشن دان کے قریب پہنچے۔ یہ روشن دان چھت سے ایک فٹ اُونچا اور

تقریباً چار فٹ مربّع تھا۔ اس کے اوپر شیشے لگے ہوئے تھے اور اس وقت بند تھا۔ وہ اس روشن دان کے گِرد کھڑے ہو گئے اور نیچے کمرے میں جھانکنے لگے ضیغم نے انہیں سختی سے تاکید کر دی کہ نیچے کیسا ہی منظر دکھائی دے وہ ہرگز کوئی آواز نہ نکالیں ورنہ اُن کی خیر نہیں۔

یہ ایک لمبا چوڑا ہال تھا جس کے درمیان ایک بہت بڑے آتش دان میں آگ روشن تھی اور آگ پر ایک کڑھاؤ میں تیل کی قِسم کی کوئی چیز اُبل رہی تھی۔ ایک طرف کُرسی پر حکیم بیٹھا تھا۔ پانچ چھ حبشی قریب کھڑے تھے جو ایک کفگیر سے کڑھائی میں کھولتے ہوئے تیل کو کِسی کِسی وقت ملا دیتے۔

اچانک دو آدمیوں نے آتش دان کے قریب ایک ساخت کی مشین پر پٹّا چڑھایا اور پھر پہیّا نما چرخی پر ایک مضبوط رسّا چڑھا کر دستہ گھُمایا تو رسّے کا دوسرا اِسرا جس میں لوہے کا بڑا سا ہُک بندھا تھا چھت پر سے عین کڑھاؤ کے اوپر آیا۔ اب حکیم کے اشارے پر تین حبشی جو صِرف لنگوٹ باندھے ہوتے تھے، ایک آدمی کو پکڑ کر لے آئے۔ اس کے جسم پر بھی سوائے ایک جانگیے کے کوئی کپڑا نہ تھا۔

اس کی آنکھوں پر سیاہ پٹّی بندھی تھی۔ اس کے سرخ و سفید اور ورزشی جسم سے شُعاعیں پھُوٹتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اُسے ایک تخت پر لٹا دیا گیا اور چار حبشی اس کے بازوؤں اور ٹانگوں پر تانت لپیٹنے لگے۔ اس کے بعد اس کے دونوں پیروں میں ایک خاص قِسم کا آلہ فٹ کیا گیا جس کے نیچے کُنڈا لگا ہوا تھا۔ اس کُنڈے میں رسّے میں بندھا ہوا ہُک ڈال کر مضبوطی سے بند کر دیا گیا۔ حکیم نے اس شخص کا معائنہ کیا۔ پھر حبشی اسے ایک سٹریچر پر لٹا کر کڑھاؤ کے قریب لے آئے۔ حکیم کے اشارے پر ایک حبشی مشین کا دستہ گھُمانے لگا۔ دم بھر میں تانت میں کسا ہوا زندہ انسان کا جِسم کھولتے ہُوئے تیل کے کڑھاؤ پر اُلٹا لٹک گیا۔ پندرہ منٹ کے بعد اس کے ناک اور مُنہ سے چربی کے زرد زرد گُچھے نِکل نِکل کر تیل میں گِرنے لگے۔ ان گچھوں کو دو حبشی جو سوراخ دار کفگیر پکڑے ہوئے تھے نکال نکال کر شیشے کے ایک چوڑے لگن میں ڈالتے جاتے۔ یہ منظر دیکھ کر قاسم اور اُس کے ساتھیوں کو یُوں محسوس ہوا جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہے ہوں۔ اس خیال سے ان کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ ایک دن اُن کا

بھی یہی حشر ہونے والا ہے۔ اب اُن کی سمجھ میں آیا جابِر خان اپنے مہمانوں کو اسی لیے اتنا کھِلاتا پلاتا ہے کہ ان کے جسم میں چربی کثرت سے پیدا ہو۔ بعد میں ضیغم نے اُنہیں بتایا کہ اِس طریقے سے اِنسانی چربی حاصل کر کے وُہ اس حکیم سے ایک قسم کا مرہم بنواتا ہے جسے ''مومیائی'' کہتے ہیں اور اس کے لگاتے ہی ہر قسم کے زخم اور پھوڑے فوراً اچھّے ہو جاتے ہیں۔ اس مرہم سے وہ لاکھوں روپیہ کما رہا ہے۔ دُور دُور کے ملکوں میں اس کے ہاں سے یہ مرہم جاتا ہے۔ لوگ اُسے انسانیت کا بہت بڑا مُحسن خیال کرتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ یہ شخص انسانیت کا دشمن ہے۔

دیکھتے دیکھتے شیشے کا وہ لگن چربی کے گُلگُلوں سے چوٹی تک بھر گیا۔ حکیم نے لٹکے ہوئے جسم کے قریب آ کر ایک ایسی سلاخ سے اس کے بازوؤں اور رانوں کے گرد کَسی ہوئی تانت کو چھیڑا۔ وہ اب کافی ڈھیلی پڑ گئی اور چربی کے لوتھڑوں کی جگہ اب اس کی ناک اور مُنہ سے جلے ہوئے سیاہ خُون کے لوتھرے گرنے لگے تھے۔ یہ دیکھ کر حکیم کے حُکم سے بے جان جسم کو اُتار دیا گیا۔

قاسم وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور جب اُس کے حواس درست ہوئے تو ضیغم سے پوچھنے لگا:

"کیا میرے دوست کا بھی ان بد بختوں نے یہی حشر کیا؟"

"جی ہاں۔۔۔ اس کے سوا اور وہ کرتے ہی کیا ہیں۔ سب کا یہی حشر ہوتا ہے۔" ضیغم کہنے لگا۔

"بھائی جان۔" عارف نے قاسم کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ ہمارا بھی یہی حال کریں گے؟"

مگر قاسم کسی بُت کی طرح پتھرایا ہوا بیٹھا تھا۔ اس کے ہوش و حواس گُم تھے۔ اسے اپنے دوست کے انجام کا خیال کر کے سکتہ ہو گیا تھا۔ مگر ان بچّوں کی حالت کا خیال کر کے چند لمحوں کے بعد اس نے اپنے آپ کو جھنجھوڑا اور نیم تاریکی میں لڑکوں کے خوف زدہ چہروں پر نگاہ ڈالتے ہوئے اس نے دِل میں کہا۔ "ان معصوموں کو وہ اپنی حفاظت کی ضمانت پر لائے تھے۔ ان کا یہ انجام نہ ہونا چاہیے۔"

"بھائی جان۔" عارف نے پھر دردناک آواز میں اُسے پکارا۔

"تسلّی رکھو میرے دوستو۔ میں ہر ممکن کوشش کر کے تمھیں اس خطرناک مقام سے باہر نکالوں گا۔" اس نے دونوں لڑکوں کو بازوؤں میں لے کر اپنے سینے سے لگالیا اور اپنے دوست عاقل کو یاد کر کے بے اختیار رونے لگا۔

"عاقل نے تمہاری حفاظت کا وعدہ کیا تھا بچّو، اس کا وعدہ میری زندگی کی قیمت پر بھی پورا ہو گا۔ تُم فکر نہ کرو۔"

ضیغم نے قاسم کے بازُو کو چھُو کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا مگر قاسم نے اُسے کھینچ کر اپنے قریب بٹھالیا۔

"ضیغم، میرے اچھّے بھائی! خدا اور رسول کے نام پر ہمیں اس دردناک انجام سے بچالو۔ اللہ تمھیں اس کے لیے جزائے خیر دے گا۔۔۔۔۔ خُدا کے لیے کوئی طریقہ سوچو۔"

"میں ضرور کوشش کروں گا۔ اب چُپ چاپ واپس چلیے اور گھبراہٹ یا خوف

کے آثار اپنے چہرے پر ظاہر نہ کریں۔ خُدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس دُعا کیجیے۔"

ضیغم نے اُنہیں تسلّی دیتے ہوئے کہا اور اس کے بعد جس طریقے سے وہ اس جگہ پہنچے تھے اسی طریقے سے واپس آ کر کمند کے ذریعے اُوپر چڑھے۔ ضیغم انہیں تسلّی دے کر نیچے ہی سے رُخصت ہو گیا۔

وہ تینوں رات بھر سو نہ سکے اور اس جگہ سے نکلنے کی ترکیبیں سوچتے رہے۔

فرار

اب تو ایک ایک منٹ گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ تینوں کی بھوک پیاس جاتی رہی۔ ہر دم یہی دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں آنے والی رات ان میں سے کسی کے لیے موت کا پیغام لے کر نہ آ رہی ہو۔ اسی خدشے سے تینوں پل بھر کے لیے بھی ایک دوسرے سے علیحدہ نہ ہوتے تھے۔ زندہ انسانی جسم میں سے "مومیائی" نکالنے کا ہولناک نظّارہ ہر وقت ان کی نگاہوں کے سامنے موجود رہتا اور رہ رہ کر کپکپی سی محسوس ہوتی تھی۔ جب بھی انہیں ضیغم سے ملنے کا موقع ملتا وہ اس کی منّت سماجت کرتے کہ وہ کسی طرح یہاں سے نکلنے میں ان کی مدد کرے۔ وہ انہیں

تسلّی دیتا۔ لیکن جوں جوں دن گزرتے جاتے اُن کی مایوسی بڑھتی جاتی۔ آخر کار وہ سوچنے لگے کہ ضیغم انہیں ٹال رہا ہے اور وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکے گا۔

آخر نا اُمّیدی کے اندھیروں میں اُمّید کی کرن پھوٹی اور ایک شام کھانا کھانے کے بعد ضیغم نے احتیاط سے دروازہ بند کر کے قاسم سے کچھ باتیں کیں اور چلا گیا۔ پہر رات گئے قاسم نے اُٹھ کر کھڑکی کھولی اور باہر جھانکنے لگا۔ عارف اور اعظم اس کے پیچھے کھڑے تھے۔ آخر اندھیرے میں قاسم کو ایک پرچھائیں سی حرکت کرتی دکھائی دی اور چند منٹ کے بعد اُس دن کی طرح قاسم نے لپک کر کمند کا سرا پکڑ لیا اور وہ تینوں باری باری کمند کے ذریعے نیچے اُتر گئے۔

ضیغم نے انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور محل کے پچھواڑے گھنے ذخیرے کی طرف چلا۔ مغربی سمت، چہار دیواری کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ گھنے جھاڑ جھنکار میں گھُس گیا۔ وہ تینوں بھی اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ اس جگہ دیوار میں ایک خاصا چوڑا سوراخ تھا جس میں سے آدمی بخوبی گُزر سکتا تھا۔ وہ تینوں باری باری اس سوراخ میں سے نکل کر دیوار کے اس پار پہنچے۔ یہاں ایک بہت بڑا

اصطبل تھا جس میں بے شمار اونٹ اور گھوڑے بندھے تھے۔ سائیس اور اصطبل کے خادم چارپائیوں پر پڑے سو رہے تھے۔

قاسم نے ضیغم کا بازو پکڑ کر اس کے کان میں آہستہ سے کہا۔ ”اگر ان بدبختوں میں سے کوئی جاگ اُٹھا تو؟“

”کوئی نہیں جاگ سکتا۔ میں نے آج شام باورچی خانے میں جا کر ان کے کھانے میں ایک جڑی بوٹی ڈال دی تھی جس کے کھانے سے آدمی گھنٹوں نشے میں پڑا رہتا ہے۔“

ضیغم نے کہا اور پھر قاسم کی مدد سے جلدی جلدی تیز رفتار گھوڑوں پر زین کسی۔ پھر اصطبل کے داروغہ کے سرہانے سے چابیوں کا گُچھا نکال کر بڑے دروازے کا قُفل کھولا اور چاروں گھوڑوں کو باری باری باہر نکالا۔ پھر قاسم سے کہنے لگا۔

”باہر میرا انتظار کرو۔ میں ابھی آیا۔“

اِتنا کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ یہ حیران تھے کہ ضیغم کون سے راستے سے

آئے گا۔ چاند کی ہلکی روشنی میں وہ اردگرد نظر دوڑا رہے تھے کہ ضیغم عین اُن کے اُوپر کی دیوار پر دکھائی دیا۔ قاسم نے گھوڑا دیوار کے ساتھ لگا دیا اور ضیغم بڑی پھرُتی سے کُود کر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ گیا۔

"لو اب دِن نکلنے سے پہلے پہلے زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کر لو۔" ضیغم نے رُکاب میں پیر ڈال کر لگام سنبھالتے ہوئے کہا۔

"تم بھی ہمارے ساتھ جا رہے ہو ضیغم؟" عارف نے پوچھا۔

"ہاں میں پیچھے رہ جاؤں تو پل بھر میں گردن اُڑا دی جائے گی کیونکہ آپ لوگوں کی نگرانی میرے ذمّے ہے۔" ضیغم نے کہا اور گھوڑے کو ایڑ لگائی۔

"ہم لوگ کہاں جا رہے ہیں؟" قاسم نے پوچھا۔

"یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔ جہاں خُدا لے جائے۔"

انہوں نے تیزی سے گھوڑوں کو دوڑانا شروع کیا اور دِن نکلنے تک اسی رفتار سے چلتے رہے۔ سورج سر پر آگیا تو انہیں بھوک اور تکان محسوس ہوئی۔ ضیغم ایک

تھیلے میں کھانے پینے کا کچھ سامان لے آیا تھا۔ ایک جگہ چھُپ کر اُنہوں نے ناشتا کیا اور پھر گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ کُچھ فاصلے پر چٹانوں کے پیچھے انہیں دھواں نظر آیا۔

یہ سوچ کر کہ کوئی آبادی قریب ہے وہ اُسی طرف روانہ ہے۔ لیکن قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ دھواں ایک جھونپڑی سے اُٹھ رہا ہے۔ اُنہوں نے گھوڑوں کو ایک چٹان کے پاس جھاڑیوں سے باندھ دیا اور خود دبے پاؤں جھونپڑی کی طرف چلے۔ جھونپڑی کے باہر ایک بوڑھا آدمی چولھے کے قریب بیٹھا مکئی کی روٹیاں پکا رہا تھا۔ آہٹ سُن کر بوڑھے نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔

"کون ہو بابا؟ یہاں کیسے آنا ہوا؟" وہ آنکھیں پھاڑے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اُسے بہت حیرت ہوئی ہو۔

"ہم مسافر ہیں بابا جی۔" قاسم نے جواب دیا اور چاروں اس کے سامنے آموجود ہوئے۔

"مسافر ہو تو کیا تمہاری شامت آئی ہے جو اس طرف کا رُخ کیا۔ دُنیا میں اور کوئی

جگہ نہ ملی تھی سیر کرنے کے لیے۔" بوڑھے نے اُنہیں گھور گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہاں کیا بات ہے حضرت؟ ہمیں اس طرف کیوں نہیں آنا چاہیے تھا۔" ضیغم نے پوچھا۔

"تمہیں جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔" بوڑھے نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے اُسے سر سے پیر تک دیکھا۔ یہ لوگ آگے بڑھ کر قریب پڑے ہوئے بڑے بڑے پتھروں پر بیٹھ گئے۔

"کیا آپ جابِر خاں کی وجہ سے ایسا کہہ رہے ہیں؟" ضیغم نے کہا تو بوڑھے نے ہاتھ کی روٹی توے پر ڈالنے کے بجائے واپس گندھے ہوئے آٹے پر پھینک دی اور منہ کھول کہ حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

"تم۔۔۔ تم جابِر خاں کو جانتے ہو؟" بوڑھے نے آہستہ سے کہا۔ ضیغم نے ہاں کہتے ہوئے سر ہلایا۔

"ارے۔۔۔ تم اس کی قید سے تو نہیں بھاگ نکلے؟" بوڑھے نے چونک کر پُوچھا۔ اس کی صُورت سے خوف ظاہر تھا۔

"ہاں بابا۔" ضیغم نے جواب دیا اور پھر اس نے بوڑھے کو ساری داستان سنائی۔

"لیکن میرے بد نصیب بچّو، تم اب بھی اس دیو کے چُنگل سے نہ بچ سکو گے۔ اس نے تمہاری تلاش میں اپنے آدمی سارے صحرا میں پھیلا دیے ہوں گے۔ کوئی نہ کوئی سانڈنی سوار تمہیں دیکھ لے گیا اور تُم پکڑے جاؤ گے۔" بوڑھے کی آنکھوں میں نااُمّیدی تھی۔

"ہمارے پاس گھوڑے ہیں۔ ہم ابھی روانہ ہو جاتے ہیں۔" قاسم نے جواب دیا۔

"نہیں نہیں۔ تم ضرور پکڑے جاؤ گے۔" بوڑھے نے سر ہلا کر کہا۔

"پھر آپ ہی بتایئے ہم کیا کریں؟" قاسم نے پوچھا۔

"رات کے وقت سفر کرو۔ دِن کو کہیں چھپ رہو۔" وہ کہنے لگا۔ "گھوڑوں کی مُصیبت ہے ورنہ میں تمہیں یہیں چھُپا لیتا۔"

"ہم گھوڑوں کو ہنکا دیتے ہیں۔ وہ واپس اپنے تھال پر پہنچ جائیں گے۔" قاسم کہنے لگا۔

"مگر سفر کیسے جاری رکھیں گے۔ ہمارے ساتھ یہ لڑکے نہ ہوتے تو ہم پیدل بھی چل لیتے۔" ضیغم کہنے لگا۔

بُوڑھا سر جھکائے کُچھ سوچ رہا تھا۔ آخر اس کی تجویز پر انہوں نے اپنے گھوڑوں کو ایک کھوہ لے کا کر باندھ دیا اور بوڑھے نے انہیں اپنی جھونپڑی کے نیچے ایک خفیہ تہہ خانے میں چھپا دیا جو اصل میں ایک چھوٹی سی کھوہ ہی تھی۔ اس کے سامنے لکڑی کے دو صندوق اس طرح اُوپر نیچے رکھے ہوئے تھے کہ اس کا دہانہ نظر نہیں آتا تھا۔

سارا دِن یوُنہی گزر گیا۔ تیسرے پہر بوڑھے نے چولھے میں آگ جلائی اور مکئی کا آٹا گوندھ کر مہمانوں کے لیے روٹیاں پکانے لگا۔ اس نے ابھی تین روٹیاں ہی پکائی تھیں اور چوتھی کے لیے پیڑا بنا رہا تھا کہ قدموں کی آہٹ سنائی دی اور ساتھ ہی اونٹ کے بلبلانے کی آواز آئی۔ بوڑھا زور سے چونکا اور اُس رخنے کی طرف

دیکھنے لگا جو چٹانوں کے درمیان دروازے کا کام دیتا تھا۔ ایک سانڈنی سوار اندر داخل ہوا اور سلام کر کے پوچھنے لگا۔

"یمنی بابا، اسی طرف سے چار سوار تو نہیں گُزرے؟"

"مہینے گزر جاتے ہیں انسان کی صُورت نظر نہیں آتی۔ تُم ایک چھوڑ چار کا ذکر کر رہے ہو۔"

بُوڑھے نے جسے لوگ یمنی بابا کہہ کر پکارتے تھے، گول مول جواب دیا۔ سانڈنی سوار نے بڑے غور سے بابا کے چہرے کو دیکھا اور قریب ہی ایک اُونچے پتھر پر بیٹھ گیا۔

"یہ اتنی روٹیاں کس لیے پکا رہے ہو؟ تمہارے لیے تو ایک ہی کافی ہے۔"

"شاید اُن چار سواروں کو کھلانی پڑے جن کا تم ذکر کر رہے ہو؟" بڈھے نے ہنس کی بات ٹالی۔

"بابا، تم ہنستے ہو اور جابِر خاں نے قیامت مچا رکھی ہے۔" وہ بسور کر بولا۔

"چار آدمیوں کو پکڑنے تم اکیلے ہی نکلے ہو؟" بابا نے پوچھا۔

"نہیں تو۔۔۔ ہم آٹھ سانڈنی سوار ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"لو تم آرام سے بیٹھ کر روٹی کھاؤ۔ باقی ساتوں انہیں خود ہی ڈھونڈھ لائیں گے یا جابِر خاں بد بخت کے چنگل سے بچ کر نکل جانے دیں گے بے چاروں کو۔"

بوڑھے نے ایک مٹّی کی رکابی میں مکئی کی روٹی رکھ کر اپنے مہمان کے آگے رکھ دی اور پیالے میں دودھ ڈال کر دیا۔

"لو کھاؤ۔ صُبح سے ہو نہی پھر رہے ہو گے۔"

وہ روٹی کھانے لگا۔ اتنے میں ایک اور آدمی آ گیا۔

"اچھا۔ تم یہاں آرام سے بیٹھے روٹیاں توڑ رہے ہو اور ہم جنگل کی خاک چھانتے پھر رہے ہیں۔" وُہ غصّے کے مارے بابا کو سلام کرنا بھُول گیا۔

"توبہ۔ کیسی مصیبت ہے تم لوگوں کو بھی۔ بیٹھو روٹی کھاؤ۔" بابا نے اُسے بھی ایک روٹی اور دودھ کا پیالہ دیا۔ بابا کے اخلاق اور مہربانی کے سلُوک سے اُنہیں

جرأت ہی نہ ہوئی کہ وہ اس کی کٹیا کی تلاشی لیتے۔ جب انہوں نے روٹی ختم کرلی تو سلام کر کے چلے گئے۔

بابا نے مکئی کی روٹیاں اور دودھ قاسم اور اُس کے ساتھوں کو بھی پہنچایا۔ وہ دن بھر کے بھوکے پیاسے تھے۔ خُوب پیٹ بھر کے کھایا۔ جب اندھیرا ہو گیا تو بابا نے انہیں باہر آنے کو کہا اور راستے کے متعلق سمجھایا کہ شمال مغربی سمت چلتے جائیں تو دِن چڑھتے چڑھتے خِضر خاں کے گاؤں "حاجی آباد" میں پہنچ جائیں گے۔ بابا نے انہیں یقین دلایا کہ خِضر خاں بہت نیک آدمی ہے۔ وہ ایسا نہیں کہ اپنے مہمانوں کو بیچ کھائے۔ جابِر خاں نے سراسر جھُوٹ بولا۔

"بے دھڑک اس کے پاس چلے جاؤ اور ساری واردات بیان کرو۔ میں بہت دِنوں سے یہ چاہتا تھا کہ کِسی صورت خِضر خاں کو اس انسان نما درندے جابِر خان کی اصلیت سے آگاہ کروں لیکن آج تک موقع نہ ملا۔ جب سے خِضر خاں کا باپ فوت ہوا اُن لوگوں میں سے کوئی بھی میرے پاس آتا جاتا نہیں۔" یمنی بابا کہنے لگے۔

"بابا، تعجّب کی بات تو یہ ہے کہ جابِر خان نے خِضر خان کو کیسے چھوڑ دیا؟" قاسم نے پوچھا۔

"جابِر خاں جانتا ہے کہ خِضر خاں کتنی طاقت کا مالک ہے۔ اگر خِضر خاں جباریہ آکر واپس نہ جائے تو اُس کے قبیلے والے جباریہ کو بنیادوں سے اُکھیڑ کر رکھ دیں۔" بابا نے جواب دیا۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔ جابِر خاں خِضر خاں کے قبیلے سے ڈرتا ہے۔" قاسم کہنے لگا۔

"ہاں۔۔۔ اس کے علاوہ خِضر خاں سے اُسے فائدہ بھی تو پہنچتا رہتا ہے۔ وہ اپنے مہمانوں کو سیر و شکار کی دعوت دے کر جابِر خاں کے ہاں لے جاتا ہے اور جابِر خاں اسے جُل دے کر اُن لوگوں کو روک لیتا ہے۔ خِضر خاں کا خیال ہو گا کہ تُم لوگوں کو تحفے تحائف دے کر جابِر خاں نے رُخصت کر دیا ہو گا۔ تم ضُرور اُسے اصل بات سے آگاہ کرو تاکہ وہ اس خطرناک آدمی سے خبردار ہو جائے۔"

یمنی بابا نے کہا اور پھر دعائیں دے کر ان لوگوں کو رُخصت کیا۔

تعاقب

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ چاند نکل آیا تھا۔ چاندنی صحرا اور پہاڑوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ ٹھنڈی ہوا تِیر کی طرح جسم کو چھید رہی تھی۔ قاسم اور اس کے ساتھی چٹیل پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ تیز رفتاری سے چلے جا رہے تھے۔ چاندنی کے باعث اُنہیں راستہ تلاش کرنے میں دقّت نہ ہوئی۔ اس راستے کو وہ جانتے تھے۔ خِضر خاں اُنہیں اسی طرف سے لایا تھا۔ ان کی کوشش تھی کہ رات کی رات میں جابِر خاں کی حدود سے نِکل جائیں۔ یمنی بابا نے انہیں بتایا تھا کہ چٹانوں کے اس پار جابِر خاں کے آدمی نہیں جاسکتے اور انہیں جلد از جلد صحرا عبور کر کے

کوہستانی علاقے میں داخل ہو جانا چاہیے۔

آدھی رات تک اُنہوں نے صحرا کا مشکل آدھا سفر طے کیا تھا اور باقی سفر کے لیے لازم تھا کہ وہ رُکے بغیر چلتے جائیں تو کہیں پو پھٹتے کوہستانی علاقے میں داخل ہوں گے۔

ضیغم آگے آگے تھا۔ اچانک وہ ایک بڑی چٹان کا چکّر کاٹ کر ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ لیکن چند ہی منٹ کے بعد انہوں نے اُسے واپس آتے دیکھا تو گبھرا کر اپنے گھوڑوں کی لگامیں کھینچ لیں۔ ضیغم اشارے سے کہہ رہا تھا کہ وہیں رُک جاؤ۔

"کیا بات ہے ضیغم؟" قاسم نے پوچھا۔

"ایک سانڈنی سوار کو میں نے اس طرف آتے دیکھا ہے۔ وہ غالباً سرحد تک کا چکّر لگا کر واپس آیا ہو گا۔ شکر ہے کہ میں اندھیرے میں تھا۔ ورنہ وہ مجھے دیکھ لیتا۔"

”پھر اب کیا کرنا ہے؟“ قاسم نے پُوچھا۔

”چُپ چاپ یہیں چٹانوں کی آڑ میں کھڑے رہتے ہیں۔ وہ آتا ہی ہو گا۔ میں نے دُور سے دیکھ کر ہی لگام کھینچ لی اور واپس پلٹ آیا۔“ ضیغم نے کہا۔

”یمنی بابا تو کہہ رہے تھے کہ ان سانڈنی سواروں نے کہا تھا کہ اب ہم واپس چلے جائیں گے۔“ عرفی نے کہا۔

”انہوں نے یمنی بابا سے جھوٹ کہا ہو گا۔“ عظمی بولا۔

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جابِر خاں نے زیادہ آدمی بھیجے ہوں۔ ان کے پاس تو صرف چار ہی آدمی آئے تھے۔ اور یمنی بابا نے یہ بھی تو کہا تھا کہ ہمیں ان کی بات پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ واپس جانے کے بجائے وہ تلاش جاری رکھیں۔“ ضیغم کہنے لگا۔

اتنے میں انہیں رتیلے میدان میں ایک سانڈنی سوار نظر آیا۔ وہ ان سے خاصے فاصلہ پر تھا۔ پھر بھی یہ سب چُپ ہو گئے اور دُور تک اُسے جاتا دیکھتے رہے۔ جب

وہ ریتلے ٹیلوں کے پیچھے غائب ہو گیا تو انہوں نے پھر آگے بڑھنے کا ارادہ کیا۔

"بھائی جان۔" عرفی نے سہمے ہوتے لہجے میں قاسم سے کہا۔

"کیا بات ہے عارف؟" قاسم نے پوچھا۔

"اس سانڈنی سوار کو تو ضیغم بھائی نے دیکھ لیا اور ہم لوگوں کو چھپنے کا موقع مل گیا۔ فرض کیجیے زیادہ آدمی اس طرف گئے ہوئے ہوں اور ہمارا اُن کا سامنا ہو جائے تو کیا کریں گے؟"

"ہاں بھائی جان۔ ہمارے پاس تو کوئی ہتھیار بھی نہیں۔" عظمی نے گھبرا کے کہا۔

"ہتھیار نہ سہی ہاتھ تو ہیں۔ یہ دیکھو۔ کسی نے ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کی تو میں یوں اس کے جبڑے چیر دوں گا۔" ضیغم نے ہاتھوں سے چیرنے کا اشارہ کیا تو قاسم نے مُسکرا کر داد دی۔

"ضیغم تو ضیغم ہے۔ جانتے ہو عرفی؟ ضیغم کا مطلب ہے شیر۔" قاسم نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا۔

”چلو، اللہ کا نام لو اور گھوڑوں کو ایڑ لگاؤ۔ خُدا ہماری حفاظت کرے گا۔“ ضیغم نے کہا۔

ابھی انہوں نے چند میل طے کیے ہوں گے کہ سامنے سے ایک اور سانڈنی سوار آتا دکھائی دیا۔ اس دفعہ انہیں چھُپنے کا موقع نہ ملا اور ایک دم آمنا سامنا ہو گیا۔ سانڈنی سوار نے دیکھتے ہی نعرہ لگایا:

”رُک جاؤ۔ ایک قدم آگے نہ بڑھانا ورنہ گولی مار دوں گا۔“

ضیغم کُچھ کہنے کو تھا کہ قاسم نے اُسے روکا اور خود چلّا کہ کہنے لگا۔

”ہم اپنا سفر جاری رکھیں گے۔ دیکھیں تم ہمیں کیسے روکتے ہو۔ اس سے پہلے کہ تم اپنی جگہ سے حرکت کرو میں خُود تمہیں گولی کا نشانہ بنا دوں گا۔۔۔ میں اپنے ساتھیوں کو بھیج رہا ہوں۔ اپنے ہتھیار ان کے حوالے کر کے اپنے راستے چلے جاؤ۔ اگر تم نے ذرا بھی حجّت کی تو میں اپنے پستول کی تمام گولیاں تمہارے جسم کے پار کر دوں گا۔“

یہ کہہ کر اس نے ہاتھ کو یوں تان دیا جیسے پستول پکڑ رکھا ہو۔ وہ ایک چٹان کے سائے میں کھڑا تھا۔ اس لیے سانڈنی سوار کو جو کئی گز کے فاصلے پر تھا دھوکا دینے میں کامیاب ہو گیا۔ ضیغم عُرفی اور عظمیٰ نے ایک ہی جست میں سانڈنی سوار کو جا لیا اور اس کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔

"اپنے ہتھیار ہمارے حوالے کر دو۔" عُرفی نے بڑی دلیری سے کہا اور پھر خود ہی جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے رائفل چھین لی۔

"اور یہ بھالا میرے کام آئے گا۔" ضیغم نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ارے۔۔۔ ضیغم تم بول سکتے ہو؟" سانڈنی سوار حیرت سے بولا۔

"ہاں۔ مجھے ان لوگوں نے بولنا سکھا دیا ہے۔" ضیغم نے اس کے ہاتھ سے نیزہ چھین کر کہا۔

"بس اب اِسے جانے دو۔ مگر اتنا بتا دو کہ اگر اِس نے اپنے کسی ساتھی کو ہماری سے مقابلے کے لیے بھیجا تو اس کا بھی یہی حشر ہو گا۔" قاسم نے وہیں سے للکار کر

کہا۔ وہ ابھی تک اپنا فرضی پستول تانے کھڑا تھا۔

"میں تو کہتا ہوں قاسم بھائی، ظالم کو زندہ چھوڑ دینا گناہ ہے۔ جس سے خطرہ ہو اُسے مار ڈالنا بہتر ہے۔" ضیغم نے بھالے کی نوک سوار کے سینے پر رکھ دی۔ وہ خوف زدہ ہو کر بولا۔

"نہیں نہیں، میں کسی سے کچھ نہ کہوں گا۔ بلکہ میں خود اب جابِر خاں کے پاس جانا نہیں چاہتا۔ تُم لوگ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ میں عُمر بھر سردار قاسم کا خادِم بن کر رہوں گا۔"

"ہمیں دھوکا تو نہیں دو گے؟" ضیغم نے پوچھا۔

"قسم لے لو۔ میں جابِر خاں کے ظلم میں شریک رہنا نہیں چاہتا اور تمہاری پناہ میں آنا چاہتا ہوں۔۔۔ مجھے پناہ دو سردار قاسم۔" اُس نے پکار کر کہا۔

"چلو، ہم نے پناہ دی۔ ہمارے آگے آگے چلے چلو۔"

اور سانڈنی سوار نے جس کا نام قادر تھا سانڈنی کی مُہار پھیر لی اور قاسم اور اس کے

ساتھیوں میں شامل ہو گیا۔

"دو ہرکارے اور بھی آگے گئے ہوئے ہیں۔ ہمیں ان کے راستے سے کترا کر چٹانوں کے ساتھ ساتھ چلنا چاہیے۔" قادر نے اپنی دوستی اور خیر خواہی کا ثبوت دینے کے لیے کہا۔

قاسم خاموشی سے چلا جا رہا تھا۔ اب اس کی طبیعت میں وہ ہنسی مذاق باقی نہ رہا تھا۔ عاقل کے ایسے ہولناک انجام کے بعد وہ بالکل گُم سُم ہو کر رہ گیا تھا اور بہت ہی کم بات کرتا تھا۔ خاصی دیر وہ چُپ چاپ چلتے گئے۔ چاندنی میں صحرائی میدان دُور تک صاف نظر آتا تھا۔ یکایک ان کی نگاہ سامنے سے آتے ہوئے دو سانڈنی سواروں پر پڑی۔

"اب کیا کرنا چاہیے؟ کترا کر نکل جانے کی کوشش کریں یا مقابلہ کریں؟" ضیغم نے اپنے ساتھیوں کی رائے پُوچھی۔ "اگر وہ ہمیں دیکھ لیں تو مقابلہ ہی کرنا پڑے گا۔ بچ کر نکل سکیں تو زیادہ بہتر ہو گا۔ کیونکہ ہم نے مشکل سے آدھا سفر طے کیا ہے اور دِن نکلنے کو ہے۔" قاسم نے کہا۔

"ہمیں آگے بڑھ کر اُس بڑی چٹان کی اوٹ میں ٹھہر جانا چاہیے۔ جب وہ یہاں سے گزر کر ان جھاڑیوں سے آگے بڑھ جائیں تو ہم آگے چل سکتے ہیں۔" قادر نے کہا اور سب اس چٹان کی طرف تیزی سے چلے جس کے پیچھے چھُپنے کا قادر نے مشورہ دیا تھا۔ یہ بہت اُونچی چٹان تھی اور قادر بھی اونٹنی پر سوار ہونے کے باوجود اس کے پیچھے آسانی سے چھُپ سکتا تھا۔ یہ لوگ بے فکری سے اپنی پناہ گاہ میں کھڑے سانڈنی سواروں کے گزر جانے کا انتظار کر رہتے تھے کہ یکایک وہ سانڈنیاں دوڑاتے ہوئے قریب آ گئے۔ اور ان میں سے ایک نے ہاتھ اُٹھا کر اس مقام کی طرف اشارہ کیا جہاں یہ لوگ چھُپے کھڑے تھے۔

"شاید انہوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔" ضیغم لہنے لگا۔

"شاید۔۔۔۔" قاسم نے جواب دیا۔ اُسے حیرت تھی کہ انہوں نے کس طرح انہیں دیکھ لیا۔ اتنے میں وہ دونوں اسی طرف مڑے اور ان کے بالکل قریب آ گئے۔

"میرے خیال میں تو یہ صرف تمہارا وہم تھا۔ وہ لوگ تو گھوڑے لے کر گئے ہیں

اور تُم کہتے ہو کہ کوئی ناقہ سوار نظر آیا تھا۔" ان میں سے ایک شخص کہنے لگا۔

"میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ ان دو چٹانوں کے درمیان جہاں چاند کی روشنی پڑ رہی ہے ایک سانڈنی سوار گزرا ہے۔ ممکن ہے وہ ہمارا ہی آدمی ہو۔ سوال تو یہ ہے کہ وہ گیا کہاں؟ ہمیں دیکھ کر اس کا چھپ جانا تو کوئی معنی نہیں رکھتا؟" دوسرے نے حیرت سے کہا اور قریب تھا کہ وہ اپنی اونٹی کو بڑھا کر اس چٹان کی طرف آئے جس کے پیچھے یہ لوگ موجود تھے کہ ایک دم فائر ہوا اور سوار ایک ہولناک چیخ مار کے نیچے لڑھک گیا۔ دوسرے نے اپنی رائفل سنبھالی اور فائر کیا مگر یہ صرف ہوائی فائر تھا۔ کسی کو نقصان نہ پہنچا۔ البتہ اس کے جواب میں فوراً ہی دوسری طرف سے جو فائر ہوا وہ نشانے پر بیٹھا اور دوسرا سوار بھی پتھریلی زمین پر آرہا۔ دونوں اونٹیاں ڈر کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔

"چلو۔ بس اب جلدی سے نکل چلو۔" قاسم نے کہا۔

"ٹھہرو قاسم بھیا ہمیں ان کے ہتھیاروں کی ضرورت ہے۔" ضیغم کہنے لگا اور گھوڑے سے اُتر کر مُردہ آدمیوں کے سارے ہتھیار اُتار لیے۔ اس کے بعد وہ

لوگ تیز رفتاری سے منزلیں طے کرتے چلے گئے۔ دِن چڑھتے چڑھتے صحرا سے نکل کر کوہستانی علاقے میں داخل ہوگئے اور ایک محفوظ مقام پر اُترے۔ قادر اور ضیغم کے پاس کھانے کا کچھ سامان موجود تھا۔ سب نے مل کر کھانا کھایا اور پھر پڑ کر سو رہے۔ مگر ضیغم نہ سویا۔ وہ رائفل لیے پہرے پر کھڑا رہا۔ پہر دن چڑھے اس نے اپنے ساتھیوں کو جگایا اور وہ آگے چل پڑے۔ دوپہر ڈھل چکی تھی جب وہ خِضر خان کی قلعہ نما حویلی کے صدر دروازے پر دستک دے رہے تھے۔

خِضر خاں مہمانوں کی آمد کی خبر پاکر خود دروازے پر آیا اور خلافِ توقع قاسم اور اس کے ساتھیوں کو دروازہ پر دیکھ کے حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔

"جابِر خاں نے اچھّا کیا کہ آپ کو اسی راستے سے واپس بھیجا۔ اِس طرح ایک دفعہ اور آپ سے ملاقات ہوگئی۔ ورنہ وہ تو کہتا تھا کہ اپنے قافلے کے ساتھ آپ کو سندھ کی طرف سے بھیجے گا۔"

اُس نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ قاسم اگرچہ رو دینے کے قریب تھا مگر حوصلہ کرکے خاموش رہا۔

"اور ہاں۔۔۔ ہمارا دوست عاقل کہاں ہے؟ وہ آپ کے ساتھ کیوں نہیں آیا؟"

خِضر خاں نے پوچھا اور پھر قاسم کے چہرے کو غور سے دیکھا تو چونک پڑا۔

"ہیں۔۔۔؟ یہ کیا ماجرا ہے قاسم؟ تم لوگوں کی آنکھوں میں آنسو؟ الٰہی خیر۔ عاقل خیریت سے تو ہے نا؟"

"آپ انہیں اندر لے چلیے خان۔ میں سب کُچھ بتا دوں گا آپ کو۔" ضیغم نے کہا۔

"ارے ضیغم؟ تم ضیغم ہی ہو نا؟ لیکن تُم تو گُونگے تھے؟" خِضر خاں چونک کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور غور سے ضیغم کی صورت دیکھنے لگا۔

"تھا تو سہی خان، مگر اب نہیں ہُوں۔" وُہ مُسکرا کر بولا۔

"حیرت کا مقام ہے۔ خیر، آپ لوگ اندر آیئے۔ میں عاقل کے متعلق جلد از جلد جاننا چاہتا ہوں۔ خُدا کرے وہ خیریت سے ہو۔"

خِضر خاں نے کہا اور اُن کو لے کر اندر چلا گیا۔

قاسم نے رُک رُک کر ساری داستان سنائی جسے سُن کر خِضر خان جیسے بہادر آدمی کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ قاسم، عرفی اور عظمٰی کا تو روتے روتے بُرا حال ہو گیا۔

"دل چاہتا ہے کہ ابھی اور اِسی گھڑی میں روانہ ہو جاؤں اور جتنی جلدی ہو سکے اس بد بخت وحشی کو اس کے کرتوتوں کا مزا چکھاؤں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرے ہاتھوں اس کا جو حشر ہونے والا ہے اسے آپ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ اس لیے مُجھے اس وقت تک انتظار کرنا پڑے گا جب تک آپ کے سفر کی کوفت دُور ہو جائے۔" خِضر خاں نے کہا۔ اُس کی آنکھوں سے چنگاریاں برس رہی تھیں۔

"بس ہمیں ایک رات آرام کے لیے کافی ہے۔ ان لڑکوں کا خیال نہ ہوتا تو میں آپ کو اسی وقت چلنے کو کہتا۔" قاسم کہنے لگا۔

"یہ بچّے یہیں ٹھہریں گئے اور ہم کل صُبح روانہ ہو جائیں گے۔ میں اپنے آدمیوں کو تیّاری کا حکم دے دوں گا۔" خِضر خاں نے کہا۔

"خاں صاحب۔ ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں گے۔" دونوں لڑکوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔

"اچھّا بھئی، تم بھی چلنا۔" خِضر خاں نے ان کے سر پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

حملہ

خِضر خاں نے رات کا بہت سا حصّہ اپنے آدمیوں کو جمع کرنے اور لڑائی کا سامان درست کرنے میں گزارا۔ صُبح نماز کے وقت سب آئے اور نماز کے بعد ناشتے سے فارغ ہوئے۔ خِضر خاں نے اِطّلاع دی کہ سواریاں تیّار ہیں اور سب آدمی روانگی کے لیے تیّار کھڑے ہیں۔ قاسم اپنے ساتھیوں کو لے کر باہر نِکلا تو اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ کم از کم پانچ سو سوار حویلی کے باہر میدان میں جمع تھے۔ ضروری سامان اور اسلحہ سے لدے ہوئے کئی خچّر بھی موجود تھے۔ یہ لوگ حیران تھے کہ خِضر خاں نے اس قدر جلد یہ سب تیّاری

کیسے کرلی۔

خِضر خاں نے اپنے سپاسیوں کو بالکل کسی فوجی پلٹن کی طرح ترتیب دیا اور بڑی باقاعدگی کے ساتھ روانہ ہوئے۔ سارا دِن سفر کر کے پہر رات گئے یہ لوگ جباریہ کی چہار دیواری کے باہر پہنچ گئے۔ مگر سامنے کی بجائے پچھواڑے کی طرف اُترے۔ خِضر خاں کے حکم سے دیوار کو ایک جگہ ڈائنامائٹ لگا کر اُڑا دیا گیا جس سے خاصا چوڑا شگاف پیدا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ جابِر خان کے لوگ صورتِ حال کو سمجھنے پائیں، خِضر خاں مع اپنے سپاہیوں کے اندر داخل ہو گیا۔ سب سے پہلے ان لوگوں نے مطب کے حصّے پر حملہ کیا اور جو بھی مقابلے پر آیا اُسے قتل کر دیا۔ لیکن مقابلے پر آنے والے آدمی بہت ہی کم تھے۔ جیسے ان لوگوں پر حقیقت واضع ہوئی تو وہ حملہ آوروں کے ساتھ شامل ہوتے گئے۔ نہ صرف جابِر خاں کے قیدی بلکہ خود اُس کے خادِم اور غُلام بھی اس سے بیزار تھے مواقع پا کر انہوں نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

خِضر خاں نے سب سے پہلے حکیم کو ٹھکانے لگایا۔ اس کے بعد جابِر خاں کی تلاش

میں محل کی طرف بڑھا۔ لیکن محل کا صدر دروازہ مضبوطی سے بند تھا۔ چنانچہ یہاں بھی وہی طریقہ آزمانا پڑا جو چار دیواری کو توڑنے میں استعمال کیا گیا تھا۔ یعنی محل کا بہت سا حصّہ ڈائنامیٹ سے اُڑا دیا گیا اور دو ڈھائی سو مسلح آدمی جن میں زیادہ تر خُود جابِر خاں کے اپنے ملازم تھے، اس کی خوابگاہ کی طرف بڑھے اور مضبوط دروازے پر لگاتار ضربیں لگانے لگے۔ لیکن دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے تو جابر خاں کا پلنگ خالی تھا۔ وہ کسی خفیہ راستے سے پہلے ہی فرار ہو گیا تھا۔ سارے آدمی محل کے کونے کونے میں بکھر گئے اور ہر جگہ تلاش کیا مگر جابِر خاں کہیں نہ ملا۔ اب انہوں نے محل کو لوٹنا شروع کیا اور اس کے بعد اسے آگ لگا دی۔

اس ہنگامے میں عرفی اور عظمی کم عمری کی وجہ سے گھبرا گئے تھے اور سہم کر ایک طرف چمن میں کھڑے ہو گئے تھے۔ یکایک ان کی نگاہ ایک سائے پر پڑی جو دیوار کے قریب رینگتا ہوا بڑے پھاٹک کی برف بڑھ رہا تھا۔ جب وہ پھاٹک کے قریب پہنچ گیا تو عرفی نے جھپٹ کر عظمی کا بازو پکڑ لیا اور اُس کے کان میں کہا۔

”ہو نہ ہو یہ جابِر خاں ہے جو فرار ہونا چاہتا ہے، اسے جانے نہیں دینا چاہیے۔“

”ہاں۔ اگر جابِر خاں بچ کر نکل جائے تو ہنگامہ بے کار ہو گا۔ چلو کسی کو بُلا لائیں۔“ عظمی کہنے لگا۔

”اس وقت تک یہ فرار ہونے میں کامیاب ہو جائے گا۔ ہمیں اِسے نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دینا چاہیے۔“ عرفی نے کہا۔

”پھر کیا کریں۔۔۔؟“ عظمی پوچھنے لگا۔

”ہم نے یہ رائفلیں کیا دِکھانے کے لیے اُٹھا رکھیں ہیں؟ چلو اس کے پیچھے چلیں اور نشانہ بنائیں۔“ عرفی نے تجویز پیش کی اور یہ کہہ کر عظمی کا بازو کھینچا۔

دونوں آہستہ آہستہ اس سائے کے پیچھے چلے جسے انہوں نے پھاٹک کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ وہ دروازے کا تالا کھول رہا تھا کہ ”دَن“ سے فائر ہوا۔ رائفل کی گولی اُس کے شانے میں لگی۔ ساتھ ہی دوسرے فائر کی آواز آئی اور دوسری گولی اس کی ران میں جا بیٹھی۔ وہ ایک چیخ کے ساتھ زمین پر گر پڑا مگر کمر سے پستول

نکال کر اندھیرے ہی میں اُس رُخ اندھا دھند فائر کرنے لگا جس طرف سے گولیاں آئی تھیں۔ مگر دونوں لڑکے درخت کے تنے کے پیچھے بیٹھ گئے اور پے در پے دو اور فائر کیے۔ یہ فائر خطا ہوئے۔ لیکن جابِر خان پہلی گولیوں ہی سے سخت زخمی ہو چکا تھا۔ گولیوں کی آواز سُن کر کُچھ آدمی اس طرف لپکے اور لڑکوں کے اشارے پر جابِر خاں کو جا پکڑا جو زخمی ہونے کے باوجود پھاٹک کھول کر فرار ہونے کی کوشش میں تھا۔ پانچ آدمیوں نے مل کر اس کی رائفل چھین لی۔

جابِر خاں کسی شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا۔ اس کی آواز سُن کر خِضر خاں اور قاسم اُس طرف لپکے۔ وُہ جابِر خاں کی تلاش ہی میں تھے۔ اُسے زخمی اور گرفتار دیکھ کر خوش ہوئے۔ جب اُنہیں معلوم ہوا کہ یہ اُن کے نوعُمر ساتھیوں کا کارنامہ ہے تو انہیں گلے لگا کر شاباش دی۔

"میرے ننّھے دوستو، اتنے بڑے مُوذی کو مار کر خلقِ خُدا پر اِتنا بڑا احسان کیا ہے۔ اللہ کے بندے اس درندے کے شر سے محفوظ ہو گئے۔" خِضر خاں نے کہا۔

خِضر خاں کی آواز پہچان کر جابِر خاں سمجھ گیا کہ یہ آفت اُسی کے ہاتھوں نازل

ہوئی ہے۔ غصّے اور تکلیف کی حالت میں وہ اُسے کوسنے اور گالیاں دینے لگا۔

"بھائی جان اس شیطان کو کھولتے ہوئے تیل کے اُسی کڑھاؤ پر لٹکا کر اسی طرح مارا جائے جس طرح یہ لوگوں کو مارتا رہا ہے۔" عارف نے یہ کہہ کر جابِر خاں کے مُنہ پر ایک ٹھوکر ماری۔

"ٹھہرو، مجھے چند منٹ کی مہلت دو تاکہ میں آخری وقت میں وہ الفاظ اپنی زبان پر لا سکوں جو اس وقت میرے دِل میں لاوا بن کر کھول رہے ہیں۔ خُدا کے لیے مُجھے کہہ لینے دو۔ شاید اُن میں سے کسی کو عبرت حاصل ہو اور اس طرح میرے گناہوں کا کُچھ بوجھ ہلکا ہو سکے۔" جابِر خاں گڑ گڑا کے کہہ رہا تھا۔

"کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

خِضر خاں نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا تو انہوں نے جابِر خاں کو چھوڑ دیا اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر آہستہ آہستہ کپکپاتی ہوئی آواز میں کہنے لگا:

"سنو، میرا اصلی نام عطا اللہ ہے۔ میری عُمر ابھی آٹھ برس کی تھی کہ ماں مر گئی۔

باپ نے دوسری شادی کرلی۔ میری سوتیلی ماں مُجھ سے بے حد نفرت کرتی تھی۔ وہ مجھے بے دردی سے مارتی پیٹتی اور پھر اُلٹا میرے باپ سے شکایت کرتی جس پر وہ مار مار کر میری کھال اُدھیڑ دیتا۔

سوتیلی ماں کی بدسلوکی سے نفرت جیسے شیطانی جذبے نے میرے دل میں جنم لیا جو عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا اور شدّت اختیار کر گیا۔ میرا دل اچھّے اور نیک جذبات سے خالی ہوتا گیا۔ مجھے ہر شخص سے نفرت ہونے لگی۔ سکول میں مَیں اپنے سے چھوٹے بچّوں کو خوب مارتا اور برابر والوں سے دھینگا مُشتی کرتا۔ بلکہ اپنے سے بڑوں تک سے الجھ پڑتا اور پٹتا مگر مار کھانے کا تو عادی ہو چکا تھا۔ اس کی مجھے پرواہی نہ ہوتی۔ گھر پر شکایت جاتی تو باپ سے بھی سخت مار پٹتی مگر اب تو میرا جسم مار کھانے کا عادی ہو چکا تھا۔ مجھ پر خاک بھی اثر نہ ہوتا۔

جوان ہو کر تو میں شرارت کا پُتلا بن گیا۔ بُرے آدمی میرے ساتھی بن گئے۔ اُن کی شہ پر ایک دِن میں نے اپنے باپ کی تجوری کھول لی جس میں ہزاروں روپے نقد اور زیور وغیرہ تھے۔ یہ حکیم بدبخت میرے انہیں ساتھیوں میں سے ایک

ہے۔ اس کے پاس مومیائی بنانے کا نسخہ تھا۔ ہم نے ایک خفیہ تہہ خانے میں پہلے پہلے تجربہ کیا اور پھر رفتہ رفتہ بہت سارو پیہ جمع کر کے یہ جگہ بنائی اور اس وحشیانہ فعل کو اپنا کاروبار بنالیا۔"

یہ کہہ کر جابِر خان نے اپنا سر گھٹنے پر ٹیک دیا۔ خِضر خاں نے اس کے بال پکڑ کر سر کو جھٹکا دیا تو معلوم ہوا وہ مر چکا ہے۔

خِضر خاں کے حکم سے جباریہ کی ساری عمارتوں کو آگ لگا دی گئی۔ تمام قیدیوں کو رہا کر دیا گیا اور وہ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

قاسم، عارف اور اعظم کو ساتھ لے کر کوئٹہ روانہ ہو گیا۔ ضیغم بھی اُن کے ساتھ تھا۔ قاسم پہلے اعظم کے ماموں کے پاس گیا۔

وُہ لڑکوں کو دیکھ کر بہت خوش ہُوا اور قاسم کا شکریہ ادا کیا۔ پھر دونوں لڑکوں کو اُن کے گھر پہنچا دیا۔